سازِ مغرب

(اردو آہنگ میں)

حصہ دوم

مرتبہ

حسن الدین احمد

ولا اکیڈمی حیدرآباد

عزیز باغ
حیدرآباد
۹ر جولائی ۷۷ء

سازِ مغرب

(اردو آہنگ میں)

حصّہ دوم

مرتّبہ

حسن الدّین احمد

ولا اکیڈمی
(حیدرآباد)

مجلسِ ادارت

حسن الدین احمد

ڈاکٹر عنوان چشتی　اسلم محمود　جعفر عباس

سلسلہ مطبوعات ولا اکیڈیمی ۳۲

زمانہ اشاعت ـــــــ اپریل ۱۹۷۷ء
تعدادِ اشاعت ـــــــ ایک ہزار
طباعت ـ جمال پرنٹنگ پریس　کتابت ـ عبدالصبور خاں
قیمت ـــــــ بیس (۲۰) روپے

ناشر:
ولا اکیڈیمی

ملنے کا پتہ:
ولا اکیڈیمی ـ عزیز باغ ـ سلطان پورہ ـ حیدرآباد 500024

ترتیب

اُردو آہنگ	سازِ مغرب
ایک نابینا پھول والی کا گیت	Lytton
اندھی پھول والی کا گیت	
اندھی پھول والی کا گیت	
اندھی پھول والی کا گیت	
اندھی پھول والی کا گیت	
سمندر	Lord Byron
سمندر	
کوئل	William Wordsworth
کوئل	To the Cuckoo
ساعتِ مرگ	
موت کا موسم	
آئینہ میں سفید بال دیکھ کر	Benison Bailley
پہلا سفید بال	
موت اچھی کہ زندگی اچھی	William Shakespeare
زندگی اور موت	from Hamlet
فلسفۂ محبت	P.B. Shelley
رازِ الفت	Love's Philosophy
فرصت	
فرصت	

Sarojini Naidu Hussain Sagar	حسین ساگر
H. W. Longfellow The Slave's Dream	غلام کا خواب
James Shirley Death the Leveller	موت سب کو یکساں کر دیتی ہے
Leigh Hunt Abou Ben Adhem	نوعِ بشر سے محبّت
Lord Tennyson Excelsior	اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِ راہ نہیں
	دوست
William Wordsworth Butterfly	تتلی
Ella Wheeler Wilcox	کاہل کا گیت
Sarojini Naidu	نغمۂ محبّت
George Meredith My Young Usurper	ننھا غاصب
Thomas Moore	نورِ الٰہی

کسان
Pedric Colum

ہم سات ہیں
William Wordsworth
We are Seven

خواب دُنیا
William Wordsworth
All the World's a Fleeting Show

باغی انسان
William Wordsworth

یُونان کے جزیرے
Lord Byron
Isles of Greece

خُدائے نامعلوم
W.B. Yeats

بی بی حوّا آدم سے کہتی ہیں
John Milton
from Paradise Lost

چھیل چھبیلی
Robert Browning
A Pretty Woman

تھکار
H.W. Longfellow

انسان کی فصلیں
John Keats
The Human Seasons

Thomas Moore — مئی کا جواں چاند

Lord Byron — نوحہ
Elegy

H. W. Longfellow — زندگی
Psalm of Life

Alexander Pope — گوشۂ تنہائی
The Quiet Life

Elizabeth Browning — مقصودِ اُلفت
Thetma

William Shakespeare — رحم
from Merchant of Venice

Thomas Moore — گلاب کا آخری پھول گرمی کے موسم میں
The Last Rose of Summer

Sir Henry Wotton — خوش نصیب کون ہے
Character of a Happy Life

William Shakespeare — اگر موت بن خواب کی نیند ہو وے

Thomas Moore — محبت کا دن

ترانۂ مُحبّت

نشۂ حُسن

فراقِ شوہر
The Husband's Absence

چاند اور سمندر

Goldsmith
دولت

W. C. Bryant
مُرغابی
To a Waterfowl

پھُول

T. Campbell
سپاہی کا خواب
The Soldier's Dream

Benison Bailley
معرفتِ الٰہی

Tennyson
کُلُّ شَیٍٔ ہالِک

Horace Smith — ایک ممی سے خطاب
The Mummy

Robert Browning — آخری ہم رکابی
The Last Ride Together

P. B. Shelley — ایک لوے سے خطاب
To a Skylark

William Wordsworth — ابدیت کی کرنیں گہوارہ طفلی میں
Ode on Intimations of Immortality

Sir Walter Scott — شہید جفا

Oliver Goldsmith — راہبِ صحرانشیں

Lord Tennyson — عہدِ ہارون رشید

Lord Tennyson — اینک آرڈن
Enoch Arden

Lord Tennyson — شکستِ باطل

Oliver Goldsmith — قریہ ویراں
The Deserted Village

اس صنفِ ادب کے نام
جو زیادہ توجہ کی مستحق ہے

فن ترجمہ اور منظوم ترجمے

اپنے جذبات، احساسات، خواہشات اور تجربوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے انساں نے زبان کا سہارا لیا۔ اور اس عمل ترسیل کے لئے بول چال کی زبان اور تحریری زبان دونوں کا استعمال کیا۔ انسانی گروہوں اور جغرافیائی وحدتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ زبانیں وجود میں آئیں اور ایک زبان کے جاننے والوں کے لئے دوسری زبان سے واقفیت ممکن نہ رہی۔ جس طرح جذبات، احساسات، خواہشات اور تجربوں کا اظہار کسی ایک زبان میں بول چال تقریر یا تحریر کے ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح اس اظہار کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی پیش آنے لگی۔ اسی منتقلی کا نام ترجمہ ہے۔ گویا ترجمہ راست اظہار نہیں ہوتا بلکہ اصل اظہار کا عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ لازمی طور پر اصل سے کمتر ہوگا۔ اگر اصل کو نقش اوّل کہیں تو اسے نقش ثانی کہنا درست ہوگا۔

ترجمہ کو نقش ثانی کہنا اس لئے بھی واجب ہے کہ شاید ہی دنیا کی کوئی دو زبانیں ایسی ہوں جن کے الفاظ مفہوم کے اعتبار سے مشترک ہوں اور ان

کا ترجمہ یکساں ہو۔ کیوں کہ ہر انفرادی لفظ تاریخ کی دین ہوتا ہے اور اس کا اپنا تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری زبان کے مترادف لفظ کا پس منظر بالکل مختلف ہوگا۔ کہیں دو زبانوں کے دو الفاظ صرف ایک حد تک ہم معنی ہو سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ترجمہ مشکل کام ہے۔ اپنی واردات کی شرح تو اپنی ہی زبان میں کی جا سکتی ہے۔ ع

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے — آتش

یہ گویا دوسرے کے جذبات کے ابلاغ[1] اور پھر ان کی ترسیل کا کام ہے اور "زباں میری ہے بات ان کی" کے مصداق ہے۔

ترجمہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ ترجمہ مصنف کے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے خیال اور فکر کے ابلاغ اور پھر اپنی زبان میں ترسیلِ خیال یا منتقلی کا ایسا عمل ہے جو اصل کے اندازِ ترسیل طرزِ بیان۔۔ ادائے نگارش اور لب و لہجہ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہتے ہوئے کیا جائے تاکہ دوسری زبان میں منتقل ہونے کے باوجود اصل کا انداز تخاطب اور طرز تکلم برقرار رہے۔

---

[1] "مصنف کی مجرد آگہی، خیال، فکر، جذبہ یا نقطہ نظر کو الفاظ کے ذریعہ قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں"۔ ترجمہ کا فن اور روایت مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس صفحہ ۱۴۲

ترجمہ اور تفسیر میں بنیادی فرق ہے۔ تفسیر میں اصل کے منشاء کو صراحت سے بیان کیا جاتا ہے۔ تشریح بھی ایک طرح کی تفسیر ہے جس سے مراد مصنّف کے خیالات کو تفصیل سے اپنے الفاظ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ تلخیص سے مراد مصنف کے خیالات کو مختصر کر کے پیش کرنا ہے تفسیر، تشریح یا تلخیص کے مقابلے میں ترجمے میں اصل متن کو اسی اختصار کے ساتھ اپنی زبان کا جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ترجمہ کو تفسیر، تشریح یا تلخیص کے مقابلے میں زیادہ پابندیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اصل عبارت کا درست لفظی ترجمہ ہو بلکہ مصنّف کے نظریات۔ معتقدات۔ تصوّرات اور احساسات کی صحیح ترجمانی ہو۔ اصل متن کی روح اسی طریق سے برقرار رہ سکتی ہے۔ یہی ترجمانی ہے اور یہیں محض لفظی ترجمہ اور ترجمانی کا فرق واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ ترجمانی ترجمہ سے بھی دشوار تر اور نازک تر کام ہے۔

ترجمہ کے بغیر آج کوئی بھی زبان ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی کیوں کہ وہ ترجمہ ہی ہے جس کے ذریعہ کوئی زبان نئے الفاظ اصطلاحات، محاوروں اور کہاوتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔

بقول جناب جمیل جالبی "ترجمے کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعہ نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب وقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں۔"[1]

---

[1] ترجمہ کا فن اور روایت صفحہ ۱۲۲

ترجمہ ہی کے ذریعہ علوم و فنون لسانی پیراہن بدلتے ہیں اور تمام انسانیت کی مِلک بنتے ہیں ۔

ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن ہے ۔ ترجمہ کے فن میں مہارت اور قدرت پیدا کرنے کے لئے اور دوسرے ہنروں کی طرح شوق اور صلاحیت کے ساتھ تربیت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے ۔ ایک طرف وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس فن کے اصولوں سے واقفیت بھی لازم ہے ۔

اس فن کو برتنے اور اس میں مہارت تامہ پیدا کرنے کے لئے کم سے کم دو زبانوں کی ساخت اور ان کی ادبیات سے واقفیت ضروری ہے ۔ ایک طرف وہ زبان یا زبانیں جن سے ترجمہ کرنا مقصود ہو اور دوسری طرف وہ زبان جس میں ترجمہ کرنا ہو دونوں زبانوں کے مزاج کو پہچاننا بھی لازم ہے ۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو اس سے صرف واقفیت ہی کافی نہیں ہے ۔ اس زبان کی لغت، اصطلاحات، محاوروں اور خاص طور پر مترادفات پر ماہرانہ عبور ازبس ضروری ہے ۔

ترجمہ کے لئے دوسری اہم چیز موضوع سے واقفیت ہے ۔ بہ الفاظ دیگر مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصل متن کے پس منظر سے پوری واقفیت حاصل کرے ۔

ترجمہ کا بنیادی مقصد اصل متن کے خیال اور مفہوم کی مناسب ادائیگی ہے ۔ الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ مترجم کی کامیابی کے

لئے ضروری ہے کہ وہ بالطبع ذہین ہو اور اس نے اصل متن کے مزاج کو پالیا ہو اور پھر اصل کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق نیا قالب دیا ہو۔

جس طرح ترسیل کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اسی طرح ترجمے بھی مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ آسانی کے لئے ہم ان کی تین قسمیں قرار دے سکتے ہیں۔ ہر نوعیت کے ترجمے کا طریقۂ کار اور اس کے فنی مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔

پہلی قسم معلوماتی ادب یعنی خالص علمی اور سائنسی متن کے ترجموں کی ہے ان ترجموں کی حد تک مترجم کا کام معلومات کی ترسیل ہے یعنی ایک زبان میں موجود معلومات کے ذخیرہ کو دوسری لسانی برادری تک پہنچانا۔ یہ ترجمے نسبتاً آسان ہوتے ہیں۔ موضوع پر عبور اور ہر دو زبانوں اور متعلقہ علمی اصطلاحوں سے واقفیت ہو تو ترجمہ بڑی روانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان تراجم کی حد تک لغت کا استعمال معاون ہو سکتا ہے۔

دوسری قسم تہذیبی سطح کے ترجموں کی ہے۔ مثلاً افسانوں اور ناولوں کے ترجمے مترجم کا کام بقول ڈاکٹر محمد حسن ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہے۔

تیسری قسم خالص ادبی یا جمالیاتی سطح کے ترجموں کی ہے۔ ایک زبان کے تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بڑا دشوار اور نازک کام ہوتا ہے۔ کسی بھی تخلیقی فن پارہ کے ترجمہ میں کچھ باقی رہ جاتا ہے اور کچھ ضائع ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر زبان کے ادب میں اس کا اپنا اسلوب بھی شامل ہوتا ہے جس کو ترجمہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور ساتھ ہی اس زبان کے

اسلوب کو شریک کرنا ناگزیر ہوتا ہے جس میں ترجمہ کیا جائے۔ تخلیقی اور شعری ترجمے بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ ان ترجموں میں مجموعی تاثر کو پیش کرنا ہوتا ہے اور اصل تخلیق کے مرکزی خیال کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ ہر تخلیقی عمل کی طرح تخلیقی ترجمہ کا عمل بھی ایک ایسی پراسرار ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے جو سراسر ناقابل توضیح ہے۔ اس کاوش میں یہ تعین کرنا بڑا مشکل ہے کہ اکتساب کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں اور وجدان کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں تخلیقی ترجمہ کی ہر منزل ایک نیا تجربہ ہوتی ہے یہ حقیقتاً ایک دشوار کام ہے۔ شرح آرزو اپنی ہی زبان میں اور خود صاحب واردات کو بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ قلب پر جو وارداتیں گزرتی ہیں ان سب کا بیاں لب پر یا نوک قلم پر نہیں آسکتا۔ ع

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری — میرؔ

جب صاحبِ واردات کی یہ مشکل ہے تو مترجم کی مشکلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور جب شعری ترجمے منظوم بھی ہوں تو اس مشکل کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے ہماری زبان نے ترجموں کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا۔

اُردو زبان میں مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی اولیں کوشش کا سہرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سر ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تراجم برطانوی

استعمار کی تقویت کے لیئے انگریز افروں کی ایما پر کیئے گئے یہ ترجمے کسی منظّم کوشش کے طور پر اور تہذیبی خدمت کے تحت نہیں بلکہ سیاسی مصالح اور ضرورتوں کے تحت ہوئے اس کالج کے پروفیسر گلکرسٹ نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان کے قواعد" میں شیکسپیر کے ڈراموں کے اقتباسات کا تحت اللفظ اردو ترجمہ شامل کیا۔ اس طرح گلکرسٹ کی نگرانی میں فطرت لکھنوی نے انجیل مقدس کا اردو ترجمہ کیا ان دونوں تراجم کا شمار بلا شبہ جمالیاتی سطح کے ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔ منظوم تراجم کے سلسلے میں ان کا ذکر اس لیئے ضروری معلوم ہوا کہ ان ترجموں نے امکانات روشن کیئے اور منظوم ترجموں کے لیئے راستہ ہموار کیا۔

فارسی میں لفظ نظم موزوں کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں نظم کے وسیع تر تصوّر میں شاعری کی ہر صنف اور ہر شعر شامل ہے لیکن عام استعمال میں سب سے پہلے یہ لفظ انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کے لیئے استعمال ہوا اور یہ اصطلاح غیر شعوری طور پر نئی شعری تخلیقات

---

[1] اس کے برخلاف امیر پائیگاہ نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی کی نگرانی اور سرپرستی میں ترجموں کا جو کام ۱۸۳۲ء کے لگ بھگ حیدر آباد میں ہوا وہ محض علمی خدمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ خواجہ حمید الدین شاہد اپنی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" میں فرماتے ہیں "اردو زبان میں مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی منظم کوشش تھی دلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی تحریکیں اس کے بعد کی ہیں۔"

کے لئے متعین ہو گئی[1]۔ نظم کو اس متعین مفہوم کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد استعمال کیا گیا۔

جدید نظم کا بیان منظوم ترجموں کے بیان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں ہندوستان پر غیر ملکی تسلط قائم ہو جانے کے بعد مغربی اور خصوصاً انگریزی تہذیب کے اثرات سے ہماری تہذیب اور معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زبان اور شاعری بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے۔ اُردو زبان میں بھی نئے دور کا آغاز ہوا۔ دوسرے تجربوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے توسط سے اُردو میں ہیئت اور مواد کے نئے راستوں کی تلاش شعوری طور پر کی جانے لگی۔ انگریزی ادب سے فائدہ اُٹھانے کا رجحان پیدا ہوا اور انگریزی نظموں کے خیالات کو اُردو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی باضابطہ کوششیں شروع ہوئیں۔

جمالیاتی سطح کے ترجموں کے منجملہ اردو شاعروں نے منظوم ترجمے کئے تو گویا انھوں نے ایک نئے مشکل اور سنگلاخ میدان میں طبع آزمائی کی اصل نظم کی لطافتوں باریکیوں۔ نزاکتوں اور گہرائیوں سے کماحقہٗ واقفیت بغیر ترجمہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اصل نظم سے انصاف ہو سکتا ہے۔ نہ صرف دوسروں کے خیالات کو بلکہ اجنبی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنانا ایک مشکل انوکھا لیکن دلچسپ تجربہ تھا ان ترجموں نے اُردو ادب

---

[1] جدید اردو نظم اور یورپی اثرات از ڈاکٹر حامدی کاشمیری صفحہ ۱۴۔

کو جدید خیالات۔ نئی تشبیہات اور تازہ استعارے دیتے۔ اور اردو شاعری کو نئی جہت میں وسعت دی۔ انھوں نے دوسری زبان کے تخیل کو اپنی زبان میں دلکش انداز میں منتقل کرنے اور تخیّل غیر کی باریکیوں کو قائم رکھنے کے مشکل کام میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

یہ بات اور کھل کر سامنے آتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں نہ صرف بحر۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی ہے (جس کی وجہ سے صوتی اعتبار سے اُردُو شاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔) بلکہ اُردُو شاعری کا اپنا خاص انداز ہے۔ اُردُو شاعروں نے اپنے قلم کو جنبش دی تو بے شمار زنجیروں کو اس کے پاؤں میں ڈال کر کامیاب اور بامحاورہ ترجمہ کی خواہش، دوسرے کے خیالات کی ترجمانی کی کوشش، پھر یہ جستجو کہ ترجمے ترجمے نہ رہیں ترجمانی معلوم ہوں۔ اصل نظم کی جذباتی فضا کو قاری تک پہنچایا جائے۔ الفاظ کا صوتی اور لغوی انتخاب ترجمہ کی بحر اصل سے ہم آہنگ ہو۔ کامیاب ترجمہ جس میں اصل نظم کا حسن اُسی آب و تاب سے باقی رہے کوئی آسان کام نہیں۔ زبان اور حسن بیان کے راستے میں کتنی دشواریاں حائل ہوتی ہیں نظم میں استعاروں اور کنایوں کی موجودگی بھی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ ان رکاوٹوں کو اکبر الٰہ آبادی جیسے قادر الکلام شاعر نے بھی محسوس کیا۔ ع

اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط
معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں[1]

ان سب پابندیوں اور مشکلات کے باوجود نہ صرف ہمارے شاعروں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے بلکہ اکثر و بیشتر نظمیں خود بول اٹھی ہیں ہمارے شاعروں نے نہایت دلچسپ تجربے کئے ہیں اور بعض ترجموں کو بلاشبہ اصل کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

جدید اُردو نظم کی تشکیل میں منظوم تراجم کا بڑا اور قابلِ لحاظ حصہ رہا ہے[2]۔ اردو نظم کے نئے مزاج کو بنانے میں بقول جناب خلیل الرحمن اعظمی اقبالؔ کے علاوہ مخزن گروپ کے ان تمام شعراء کا بھی ہاتھ ہے جنھوں نے بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے۔ اسی

---

[1] یہ اشعار اکبرالہ آبادی کی نظم آب لوڈور سے لئے گئے ہیں جو انگریزی کے شاعر سودے کی نظم کا ترجمہ کرنے کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس نظم کو منظوم ترجمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ طالب الہ آبادی اپنی کتاب "اکبرالہ آبادی" میں رقم طراز ہیں کہ ان کے استفسار پر کہ آیا یہ نظم سودے کی نظم کا ترجمہ یا اقتباس ہے اکبرالہ آبادی نے فرمایا تھا "میری نظم میں لوڈور کے آبشار کی چھاؤں تک موجود نہیں"۔

[2] ہمایوں اور ادبی دنیا میں میاں بشیر احمد اور منصور احمد نے ایسے کامیاب اور خوبصورت منظوم ترجمے کئے جنھوں نے نظم معریٰ اور نظم آزاد کی جدید ہیئت سے اہلِ اُردو کو مانوس کیا۔

طرح جو شاعر جدید اُردو نظم کے نقیب تھے ان میں بیشتر ایسے تھے جنھوں نے منظوم تراجم کئے اور ان ترجموں کے ذریعے جدید نظم کے ارتقا میں مدد دی۔

"انجمن پنجاب" لاہور کے شاعروں محمد حسین آزاد (۱۸۳۲۔۱۹۱۰ء) اور خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) نے اردو شاعروں کو انگریزی ادب سے استفادہ کی طرف راغب کیا۔ اور خود انگریزی زبان سے کم واقفیت رکھتے ہوئے بھی انگریزی نظموں کے اُردو میں منظوم ترجمے کر کے ایک مثال قائم کی اور نیا راستہ دکھلایا۔

انجمن پنجاب کا قیام ۱۸۶۷ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے جلسہ منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں محمد حسین آزاد نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا۔

"شاعری میں نئے انداز کی خلعت جو زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوق کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے"

اُردو شاعری میں عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے ساماں بقول آزاد چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے۔

۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو انجمن کے دوسرے جلسے میں "زمستان" کے موضوع پر نظمیں پڑھی گئیں۔ اُردو نظم کی تاریخ میں طرحی مشاعرے کے مقابلے میں موضوعاتی مشاعرہ ایک انقلابی اقدام تھا۔ اس موقع پر بھی محمد حسین آزاد نے اپنی تقریر

میں اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو بدلنے اور انگریزی شاعری سے استفادہ کا واضح طور پر مشورہ دیا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے خیالات اخبار آفتاب پنجاب" کے ذریعہ بھی اُردو شعراء تک پہنچائے اور ان کو متاثر کرنا شروع کیا۔

محمد حسین آزاد نے اہلِ ملک کو انگریزی شعر و ادب کی عظمت اور پھیلاؤ کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے جدید نظم کے بارے میں اپنے خیالات بھی پیش کئے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ نظمیں بھی لکھیں جو ان کے نظریات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے اردو شاعری میں ایک نئی جان ڈالنے کی سعی کی۔

محمد حسین آزاد کی اس کوشش کی اہمیت یوں ہے کہ یہ ایک شعوری اور باضابطہ کوشش تھی۔

اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی اہلِ اُردو کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں

"تمھاری شاعری جو کہ در وبست عشق و مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیادی حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔"

مولانا حالی نے "زمزمہ قیصری" کے عنوان سے مسٹر ٹوک کی انگریزی نظم کا ترجمہ کیا۔ اصل نظم کا اردو ترجمہ ان کو دیا گیا تھا اور انھوں نے ان خیالات کو منظوم کیا۔ اسی طرح ان کی نظم "تنہائی" کا خیال انگریزی سے

لیا گیا ہے "حالی کی نظم جواں مردی کا کام" جو انھوں نے ۱۸۷۲ء میں لکھی تھی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ نہیں ہے کیوں کہ خود حالی نے اس پر یہ نوٹ دیا کہ " یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اردو میں بہ اضافہ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے"

قلق میرٹھی نے ۱۸۶۴ء میں منتخب انگریزی نظموں کا مجموعہ "جواہر منظوم" کے نام سے الہ آباد سے شائع کیا ۔ اس کو اردو منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ قلق کے منظوم تراجم پر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے نظر ثانی بھی کی تھی ۔

اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ـ۱۹۱۷ء) نے ۱۸۶۷ء میں انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے کیے ۔ ایک قانع مفلس ۔ موت کی گھڑی اور فادر ولیم کے عنوان سے کیے[1] اسماعیل میرٹھی نے اور بھی منظوم ترجمے کیے ۔

اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں ایک انتخاب اٹاوہ سے "منتخب انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے" از بانکے بہاری لال شائع ہوا ۔

مغربی نظموں کے ترجموں کی رفتار کو تیز کرنے میں ادبی رسالوں نے اہم رول ادا کیا ۔ رسالہ مخزن نے بالخصوص انگریزی نظموں کے ترجموں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ۔ اس رسالے کے اجراء کا بنیادی مقصد ہی منظوم ترجموں کی ترویج تھا ۔ اپنے پہلے شمارے میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا

---

[1] یہ ترجمے ساز مغرب (حصہ اول) میں شریک ہیں ۔

تھا اس مقصد کو اس طرح واضح کیا گیا۔

"انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں اور انگریزی نظموں بلکہ بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔

رسالہ دلگداز نے بھی اس مقصد کو آگے بڑھایا۔ عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰۔۱۹۲۶) نے نہ صرف منظوم ترجمے کئے بلکہ انگریزی نظم کے طرز بیان کے تتبع میں نظم غیر مقفیٰ (جس کے لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نظم معریٰ کا نام تجویز کیا) کا تجربہ بھی کیا۔ شرر نے اردو نظم میں اس جدید اسلوب اور جدید ہیئت کو مروج کیا اور اسے بطور ایک تحریک فروغ دیا۔

اردو کی پابند نظم میں ایک نئے انداز کی ابتدا "گورغریباں[1]" سے ہوتی ہے یہ منظوم ترجمہ نظم طباطبائی (۱۸۵۲۔۱۹۳۳ء) نے عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا تھا جو پہلی بار رسالہ دلگداز کے جولائی ۱۸۹۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس منظوم ترجمے نے سند قبولیت حاصل کی اور اس کو ان منظوم تراجم میں شمار کیا جا سکتا ہے جو اصل سے کسی طرح کم نہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے اس نظم کے تعارفی نوٹ میں لکھا "ایسی مقبول روزگار الیسی سرمایہ انگلستان نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ جناب مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نے کیا ہے مگر

---

[1] یہ ترجمہ نظم مغرب (حصہ اول) میں شریک ہے۔

کس خوبی سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے ایسی جاں گداز اور موثر نظمیں اور بحیثیت طور پر بھی اردو میں کم لکھی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرعے کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا چوتھے مصرعے سے انگریزی میں ملتا ہے اسی طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اپنی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کر اردو میں ملایا ہے اردو میں اسٹینزا کہنے کی ابتداء اس نظم سے ہوتی ہے"۔

نظم طباطبائی نے چند اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے چند نظمیں انگریزی نظموں کی اتباع میں لکھیں جو ہیئت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں۔

وحید الدین سلیم (۱۸۵۹-۱۹۲۸ء) نے چند انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے اور کمال کر دکھایا۔ ان کی نظم "گوشۂ عافیت" میں انگریزی زبان کے شاعر ڈائر کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ انھوں نے مظاہرِ فطرت سے متاثر ہو کر بھی شاعری کی۔ ایسے مواقع پر ان کی شاعری ورڈز ورتھ کی شاعری سے قریب نظر آتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں جدید نظم کے ارتقاء میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۱۸۶۶-۱۹۵۴ء) نے منظوم ترجمے کیے۔ انگریزی بلینک ورس کے تتبع میں نظم معریٰ لکھی اور انگریزی نظموں کی اسٹینزا بندی کے طرز پر اردو نظموں میں بھی اسٹینزا یا بند استعمال کیے۔

نادر علی خاں نادر کاکوروی (۱۸۶۷-۱۹۱۲ء) نے کئی انگریزی نظموں کے

منظوم تراجم کئے۔ ان ترجموں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں اصل کی پوری ترجمانی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان کے سب منظوم ترجمے بلند پایہ موثر اور کامیاب ہیں۔ بعض ترجموں میں نادر نے آزادی سے کام لیا ہے مثلاً ان کی مشہور نظم گھنٹہ نہیں بجے گا[1] کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزی نظم کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوتے وضاحتی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ان کے منظوم ترجمے "گزرے ہوئے زمانہ کی یاد[2]" کو شہ کار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں جناب ممتاز حسن لکھتے ہیں۔

"گزرے ہوتے زمانہ کی یاد" نہ صرف نادر کا بہترین ترجمہ ہے بلکہ اُردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہیئے[3]

ظفر علی خاں (۱۸۷۰ء-۱۹۵۶ء) نے چند منظوم ترجمے کئے ہیں لیکن یہ سب ترجمے معیاری اور کامیاب ہیں۔ "ندی کا راگ[4]" ایک خوبصورت نظم ہے جس کا شمار اچھے منظوم ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔

دُرگا پرشاد سرور جہاں آبادی (۱۸۷۳ء-۱۹۱۰ء) کے کلام کا زیادہ حصہ منظوم ترجموں پر مشتمل ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ملتے ہیں۔

---

[1] یہ نظم سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔ [2] یہ ترجمہ سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

[3] ماہ نو صفحہ ۱۷، دسمبر ۱۹۵۹ء) [4] یہ ترجمہ سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

ان کے سب منظوم ترجموں کو اچھے ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمے بحیثیت مجموعی تخلیقی انداز رکھتے ہیں۔ انھوں نے کچھ ترجمے سنسکرت اور ہندی سے کئے اور کچھ انگریزی سے۔ منظوم ترجموں میں انگریزی نظموں کی رُوح کو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی نظموں کے نمونوں پر نظمیں بھی لکھیں۔ بقول بادا کرشن گوپال مغموم سرور جہاں آبادی نے انگریزی کے مشہور شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا زبردست اثر ان کی شاعری پر تھا۔ انھوں نے بعض منظوم ترجموں میں اصل میں تصرف کیا ہے لیکن بیان کی خوبی سے ان تصرفات کا جواز نکلتا ہے۔

سیّد محمد ضامن کنتوری (۱۸۷۶-۱۹۴۶ء) نے چند مشہور انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ ان ترجموں کا مجموعہ "ارمغانِ فرنگ" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا جب کہ ان کی عمر پچیس[۲۵] سال تھی۔ انگریزی نظم کو اردو لباس پہنانے میں جس قدر کوششیں اس وقت تک کی گئی تھیں ان میں یہ پہلی باقاعدہ اور کامیاب کوشش تھی[۱]۔

غلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶-۱۹۵۲ء) کے مجموعہ کلام "کلامِ نیرنگ" اور "غبارِ افق" میں منظوم تراجم بھی شریک ہیں۔ "مقصودِ اُلفت" اور "جانِ شیریں"[۲] کو معیاری

---

[۱] ارمغانِ فرنگ پر تنقیدی مقالہ از محمد صادق علی خاں مخزن نومبر ۱۹۰۲ء

[۲] یہ دونوں منظوم ترجمے سازِ مغرب (حصّہ دوم) میں شریک ہیں۔

منظوم ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کی خوبصورت نظمیں "پیام صبح" "عشق اور موت" "رخصت اے بزم جہاں" انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں جو رسالہ مخزن کے اثر سے کئے گئے تھے[1] اقبال کی بعض نظمیں انگریزی نظموں کا بالکل ترجمہ تو نہیں ہیں لیکن ان نظموں میں انگریزی نظموں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

منظوم ترجموں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں جن غزل گو شعرا نے حصہ لیا ان میں حسرت موہانی (۱۸۸۱-۱۹۵۱ء) اور عزیز لکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۳۵ء) سرفہرست نظر آتے ہیں۔ باوجودیکہ حسرت موہانی نے بعد میں نظم گوئی ترک کر دی تھی ان کے منظوم ترجموں کو اعلیٰ درجہ کے ترجموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ عزیز لکھنوی نے منظوم ترجموں کے وقار کو بلند کیا اور اپنی شعری صلاحیتوں سے اس صنفِ ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

منشی مہاراج بہادر برق (۱۸۸۴-۱۹۳۶ء) نے بھی چند انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔ بقول جگت موہن لال رواں "وہ مغربی تخیل اور جذبات سے اپنے ادب کے دامن کو مالا مال کرنے کی فکر ترجموں میں کرتے ہیں[2]"۔

نواب میر جعفر علی خاں اثر لکھنوی (۱۸۸۵-۱۹۶۷ء) نے انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو نظم میں کافی تعداد میں ترجمے کئے۔ انھوں نے

---

[1] یہ ترجمے سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہیں۔ [2] مقدمہ مطلع انوار

ان ترجموں کے ذریعہ جدید نظم میں ہیئت کے کامیاب اور دلچسپ تجربے کئے۔ ان کے منظوم تراجم کا مجموعہ "رنگ بست" کے نام سے شائع ہوا[۱] اس مجموعے میں انگریزی کی نو نظموں کے منظوم ترجمے شریک ہیں۔ جن میں کسان باغی انسان۔ تھار۔ آخری وصیت کا شمار اچھے اور معیاری ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔

تلوک چند محروم (۱۸۸۷۔ ۱۹۶۶ء) نے انگریزی نظموں کی ایک بڑی تعداد کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے[۲] ان کے منظوم ترجموں کو کامیاب کوشش قرار دیا جا سکتا ہے "بچہ کا پہلا احساسِ غم"[۳] ایسی ہی نظم ہے جس کو پڑھنے سے اصل تخلیق سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔ محروم نے ترجمہ میں بھی اسٹینزا یا بند کا استعمال کیا ہے اور پہلے تیسرے اور دوسرے چوتھے مصرعوں کو ہم قافیہ کیا ہے جیسا کہ اصل میں ہے شیکسپیر کے ڈراموں کے اقتباسات کے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں۔

محمّد عظمت اللہ خاں (۱۸۸۷۔۱۹۲۷ء) نے کئی انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ کوئل۔ ننھا غاصب۔ ہم سات ہیں۔ یونان کے جزیرے

---

[۱] یہ مجموعہ اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوا۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۴۸ء سے کچھ پہلے شائع ہوا۔ [۲] چند اہم ترجمے یہ ہیں۔ موت کا موسم۔ ایک خاندان کی قبریں۔ ایام غم۔ سپاہی کا خواب۔ حسرت پرواز۔ ترانۂ عشق۔ پیمان وفا۔ بزم گفتاری حب وطن۔ کیا سے کیا۔ بقائے محبّت۔ [۳] یہ نظم سازِ مغرب حصّہ اول میں شریک ہے۔

چھیل چھبیلی۔ اگر موت ہن خواب کی نیند ہووے اور ثریا جاہ[1] ایسی نظمیں ہیں جن کو دلکش اور کامیاب ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے[2] ساتھ ہی ساتھ ان منظوم ترجموں میں ہیئت کے نئے اور انوکھے تجربے کئے گئے ہیں جن کو جدید نظم کے ارتقاء میں اہمیت کے حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔" سُریلے بول" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جو حیدرآباد سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔

حفیظ جالندھری (پیدائش ۱۹۰۰ء) کا منظوم ترجمہ "کاہل کا گیت"[3] گیت کی ہیئت میں ہے۔ اس کا شمار ان تخلیقی ترجموں میں ہے جنھوں نے جدید نظم کے ارتقاء میں مدد دی۔

یہ ایک اجمالی تذکرہ تھا اس عظیم جماعت کا جس میں ہمیں اردو ادب کے جدید دور کی بیشتر بڑی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ اس جماعت نے منظوم ترجموں کی تحریک کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کی قیادت کی اور اردو شاعروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ ان متقدمین کو رومانوی تحریک کے علمبردار انگریز شاعروں نے زیادہ متوجہ کیا۔ انکے ہم عصر اور بعد کے

---

[1] یہ سب نظمیں ساز مغرب (حصہ دوم) میں شریک ہیں۔

[2] جناب آل احمد سرور ان منظوم ترجموں کو بہت کامیاب نہیں مانتے اپنے مقالہ عظمت اللہ خاں اور سُریلے بول میں لکھتے ہیں۔ یہ حیثیت مجموعی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ باوجود کہیں کہیں دلکش ہونے کے بہت کامیاب نہیں ہے۔ [3] یہ منظوم ترجمہ ساز مغرب حصہ دوم میں شریک ہے۔

آنے والوں نے بھی اس صنف ادب کے وسیع تر میدان میں طبع آزمائی کی اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان سب کا ذکر محض خوف طوالت سے نہیں کیا جا سکا۔

حالیہ زمانہ میں جو اضافے ہوئے ہیں ان میں شان الحق حقی کا مجموعہ کلام "تارِ پیراہن" لائق ذکر ہے جو اردو اکیڈمی سندھ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا ایک حصہ "بازیافت" منتخب منظوم تراجم پر مشتمل ہے اس میں کچھ بنگالی نظموں کے ترجمے ہیں اور کچھ انگریزی۔ خوفِ مرگ اور فرصت[1] اعلیٰ درجہ کے منظوم ترجمے ہیں۔ حقی نے بقول خود "تراجم کے انتخاب میں ہاتھ رو کے رکھا ہے ورنہ سلسلہ دراز تھا" جو ترجمے اس انتخاب میں شامل نہیں ہیں اگر ان کی بھی اشاعت عمل میں آئے تو یقین ہے کہ اردو ادب میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گے۔

دوسرا قابلِ ذکر مجموعہ "نسیم مغرب" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ یہ چھبیس ۲۶ منتخب انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کا مجموعہ ہے جو امیر چند بہار کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ بہار نے منظوم ترجموں کی دشوار گذار منزل کو طے کرنے میں مقدور بھر کوشش کی اور قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔ بہار کے بعض منظوم ترجموں کو شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ انگریزی ادب پر عبور ہونے کی وجہ سے ان کے ترجمے اصل سے بہت قریب ہیں۔ بہار نے اردو ادب کو قابلِ قدر ذخیرہ مہیا کیا ہے۔

---

[1] یہ دونوں منظوم ترجمے ساز مغرب حصہ دوم میں شریک ہیں۔

اردو میں منظوم ترجموں کی روایت تقریباً ایک سو بیس سال پرانی ہے جب کہ غزل کی روایت تقریباً چار سو سال[1] کی ہے اس عرصے میں غزل گو شعرا کے مقابلہ میں جن کی تعداد شمار سے فزوں تر ہے اس جدید اور مشکل صنف میں کم و بیش ۱۵۰ شاعروں نے خاص توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ طبع آزمائی کی ان کے شہ پارے چند انفرادی مجموعوں اور زیادہ تر ادبی رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں[2] یہ عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ ایک سو بیس سال کے عرصے میں منظوم ترجموں کا کوئی انتخاب شائع نہیں ہوا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک علمی ڈھنگ سے ان شعری ترجموں کی نوعیت۔ ان کے معیار و کردار اور جدید شاعری پر ان کے اثرات کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔

اس بکھرے ہوئے اور منتشر مواد کو یکجا کرنے۔ اسے دستبردِ زمانہ سے محفوظ کرنے اور اہلِ ذوق کی خدمت میں ایک گلدستہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے منظوم ترجموں کا انتخاب ضروری تھا۔

---

[1] غزل اور مطالعہ غزل میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک جگہ دو ڈھائی سو سال اور ایک جگہ تقریباً تین سو سال لکھا ہے لیکن محمد قلی قطب شاہ ۱۵۶۵ - ۱۶۱۲ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کر لینے کے بعد غزل کی روایت تقریباً چار سو سال کی قرار پاتی ہے۔ [2] ان رسالوں میں قابلِ ذکر مخزن۔ دلگداز۔ دکن ریویو۔ افادہ۔ تمدن۔ تجلی ادیب زمانہ۔ ہمایوں۔ ادبی دنیا۔ نیرنگ خیال۔ نگار۔ عالم گیر۔ کارواں۔ شاہکار علی گڑھ میگزین اور مجلہ عثمانیہ ہیں۔

منظوم ترجموں سے مذاقِ سخن کی اصلاح اور بلاشبہ زبان و ادب کو ترقی ہوتی۔ ان ترجموں نے نہ صرف انگریزی اور اردو دونوں کی بلکہ بین الاقوامی ادب کی خدمت انجام دی۔

منظوم ترجموں سے اردو زبان کی توانائی ثابت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان شاعری اور موسیقی کے لئے بہت موزوں ہے۔ اور شاعرانہ خیالات اس میں کامیابی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں لطیف جذبات و خیالات کے اظہار کی گنجائش ہے۔

منظوم ترجموں کے مطالعہ اور منظوم ترجموں کی تحریک سے واقفیت سے جدید نظم کے ارتقاء اور اس کے مزاج کو سمجھنے میں قابلِ لحاظ مدد مل سکتی ہے۔ خود صنف غزل پر بھی منظوم ترجموں کا اثر پڑا اور ان کے ذریعہ غزل کی ہیئت میں نئے تجربے ہوئے۔

مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ منظوم ترجموں کے انتخاب کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ دوسری زبانوں میں مختلف موضوعات پر جو سوچا اور لکھا گیا ہے ان سے استفادہ کرنا اور اردو شاعری کو ان موضوعات سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ منظوم ترجموں کے ذریعہ ہمارے شاعروں کو اس امر کی جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری شاعری میں گل و بلبل اور اسی نوعیت کے روایاتی موضوعات سے ہٹ کر بھی بے شمار موضوعات ہو سکتے ہیں جن سے ہماری شاعری کا میدان وسیع اور معیار بلند ہو سکتا ہے۔

اس ضرورت اور کمی کو ولا اکیڈمی نے محسوس کیا۔ سازِ مغرب (حصہ اوّل)

کو اُردو میں منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ انتخاب قرار دیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات ہمارے لئے موجب فخر ہے۔

غیر زبانوں سے اُردو میں کئے گئے منظوم ترجموں کو بلاشبہ اُردو شاعری کی ایک علیحدہ اور مستقل صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس صنف سے اس وقت تک بے اعتنائی برتی ہے اور ناانصافی کی ہے۔ ہم نے اس کو وہ توجہ اور اہمیت نہیں دی جس کی کہ وہ بدرجہ اولےٰ مستحق ہے۔ اور نہ ہی اس صنف کے صحیح مقام اور مرتبہ کو متعین کرنے کی ایسی خاص اور باصولی کوشش کی گئی جس سے اس صنف کے افادی اور جمالیاتی پہلوؤں کے خط و خال کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ اس جدید صنف ادب کے مطالعہ پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اگر سازِ مغرب کی اشاعت سے اس صنف ادب پر خصوصی توجہ دینے کے امکانات روشن ہوتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

ولا اکیڈمی کا منصوبہ ہے کہ سازِ مغرب پانچ حصّوں پر مشتمل ہو۔ پہلا حصّہ جو ستمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے اور دوسرا جو اب پیش خدمت ہے ہر دو میں انگریزی نظموں کے ایسے تراجم کا انتخاب شریک ہے جو قدیم نظم نگاری کے طریقوں پر کاربند رہتے ہوتے روایاتی انداز کی نظم میں کئے گئے ہیں اور جن میں بحر و قوافی کی پابندی کی گئی ہے۔ البتہ ان نظموں میں ہیئت اور اسلوب کے دلچسپ تجربے ضرور کئے گئے ہیں۔ تیسرے حصّہ میں بھی ایسے ہی منظوم ترجموں کا انتخاب شامل کیا جائے گا جو نظم معریٰ (بلینک ورس) اور

نظم آزاد میں لکھی گئی ہوں ۔ پانچواں حصہ انگریزی کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں کے منظوم ترجموں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا اس کے بعد ایک مجموعہ سازِ مشرق کے نام سے پیش کیا جائے گا جس میں ہندوستانی زبانوں ۔ چینی جاپانی ۔ عربی اور فارسی کی نظموں کے نمائندہ منظوم ترجمے شامل ہوں گے۔ اس اہم پراجکٹ کی تکمیل کے لیے ولا اکیڈمی کی کونسل نے ایک مجلس ادارت تشکیل دی ہے لہٰ یقین ہے کہ یہ طریق عمل مفید ثابت ہوگا۔

سازِ مغرب (حصہ اول) میں ۳۳ شاعروں کی ۴۷ نظمیں پیش کی گئی تھیں اب ۴۵ شاعروں کی ۸۰ نظمیں پیش خدمت ہیں۔ طباعت کی اور بعض دوسری دشواریوں کی وجہ سے اس مرتبہ اصل انگریزی نظموں کو شریک نہ کیا جا سکا ۔ البتہ ایک علیحدہ فہرست جس میں منظوم ترجمہ کے عنوان کے محاذی حتی الوسع اصل نظم کا عنوان اور شاعر کا نام درج ہے شریکِ اشاعت ہے ۲ دلچسپی رکھنے والے قاری اس فہرست کی مدد سے اصل نظم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں ۔ منظوم ترجمہ کے آخر میں اگر وہ کسی رسالہ سے لیا گیا ہے تو رسالہ کا نام اور شمارہ کا ماہ وسال درج ہے ۔ ورنہ جہاں تک تعین ہو سکا منظوم ترجمے کی تصنیف کا سنہ درج ہے ۔

آٹھ انگریزی نظموں کے دو یا دو سے زائد ترجمے دستیاب ہوئے ۔ ان کو ترتیب میں اولیت دی گئی ہے ۳ ان کے بعد چار نظمیں "حسین ساگر

---

۱ ملاحظہ ہو صفحہ ۲ ۲ ملاحظہ ہو صفحات ۸ تا ۱۴ ۳ ملاحظہ ہو فہرست صفحہ ۳ و صفحہ ۸

"غلام کا خواب"، "موت سب کو یکساں کر دیتی ہے" اور "نوعِ بشر سے محبت" ان نظموں کے ترجمے ہیں جن کے دوسرے ترجمے حصۂ اول ہیں۔ خود حصۂ اول میں چار انگریزی نظموں کے دو یا دو سے زائد ترجمے شریک ہیں۔ اس طرح دونوں حصوں میں ملا کر کل ۱۶ انگریزی نظموں کے دو یا دو سے زائد ترجمے موجود ہیں۔ یہ بوقلمونی نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوگی بلکہ ایک ہی نظم کے مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ اس صنف ادب کے علمی مطالعہ کے مواقع فراہم کرے گا۔

دس طویل منظوم ترجموں کو اس انتخاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے[1]۔

مرتب کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ عظیم فن کاروں کی جانب سے کوئی اعتذار پیش کرے۔ لیکن ترجمہ بذاتِ خود کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شاعری کا ترجمہ اور وہ بھی منظوم دشوار ترین کام ہے۔ پھر تمام پابندیوں اور دشواریوں کا لحاظ کرتے۔ جو کامیابی ان ترجموں نے حاصل کی ہے۔ اس پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ترجمے خلوصِ محض کے بغیر وجود میں نہ آتے۔ شاعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مسعود حسن ادیب کے الفاظ میں کہہ رہے ہوں۔

"صاف گوئی کہتی ہے کہ جو ہو نہ سکے اُس کی ہوس کیوں کی

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست صفحہ ۱۴

جائے اپنی زبان کو سنوارنے کا شوق جواب دیتا ہے کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ ایسا گوہر بے بہا ہاتھ آئے اور میں اسے اردو کے دامن میں ٹانک نہ دوں۔ کیا عجب کہ ادبی جواہر کے پرکھنے والوں کو کہیں کہیں اس کی اصلی چمک دمک نظر آجائے"۔

یقین ہے کہ ناظرین کو یہ چمک دمک نظر آئے گی۔

سی ۷، ۳۰ کرزن روڈ اپارٹمنٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء

حسن الدین احمد
صدر ولا اکیڈمی

محمد حسین آزاد

نابینا پھول والی کا گیت

لوگو میرے پھول خریدو — کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو
پاؤں کے نیچے جو یہ زمیں ہے — سنتی ہوں لوگوں سے کہ حسیں ہے
ہیں یہ پھول اسی کے بچے — حسن ہے ماں کا ظاہر ان سے
اٹھ کے ابھی ابھی یہ ہیں آئے — گود میں ماں کے پڑے سوتے تھے
سوتوں کو یونہی اٹھا لائی ہوں — اوس کی زد سے بچا لائی ہوں
چلتی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں — ماں پڑھ پڑھ کر گویا دعائیں
پھول سے بچوں پہ دم کرتی تھی — ہر دم ان کا دم بھرتی تھی
بچوں کے لب پر یہ جو عیاں ہیں — میٹھے پیار کے ماں کے نشاں ہیں
دیکھئے تو رخسارِ مادر! — اشکِ محبت سے ہیں اب تر
دن رات ان کی ہے وہ نگہباں — فکر میں بے چین اور رہے گریاں
گاہ بہاتی آنسو خوشی سے — بچے کیسے اچھے اٹھے
قطرۂ شبنم آنسو اُس کا — ماں کی محبت ہے سرچشمہ
لوگو دُنیا نور کا گھر ہے — جس میں قلبِ یار بھی گھر ہے

زندہ رہتی ہے اس میں محبت — نام سے نفرت کے ہے نفرت
لیکن مجھ بےکس اندھی کا — گھر ہے اندھیری رات کا کالا
جس میں فقط آوازیں ہیں بستی — اور نظر آتا نہیں کوئی
گویا کھڑی ہوں نیچے زمیں کے — آفت کی ندیوں کے کنارے
اچھی بری پرچھائیاں ساری — پاس سے میرے جب ہیں گزرتی
اُن کی آوازیں سُنتی ہوں — سوچ کے پھر یہ سر دھنتی ہوں
صورتیں ہوں گی ان میں وہ بھی — کرتے ہیں عاشق پوجا جن کی
کیسی وہ شکلیں ہوں گی الٰہی — دیکھوں کیسے آنکھ ہے اندھی
دل میں جوش اُٹھتا ہے جس دم — ہاتھ کو پھیلاتی ہوں پیہم
ہائے سوائے خالی خُولی — آوازوں کے کچھ نہیں سنتی
زندہ چیز اک پرچھائیں ہے — جس میں صدا ہے جسم نہیں ہے
لوگو! میرے پھُول خریدو — کہتی ہیں کیا یہ جانیں! سنو تو
ان کو بھی دی ہے زباں اللہ نے — تاکہ کریں فریاد یہ تم سے
اس لڑکی کا سانس ہماری — مُرجھا دے گا پنکھڑیاں ساری
ہم نازک ہیں پھُول حسیں ہیں — نور کے بچے چشم زمیں ہیں
تاریکی میں رہنے والی — لڑکی سے ہے جان گھبراتی
نابینا کے قید سے ہم کو — کیجئے آزاد اب اے لوگو
بے نُور اس کی آنکھیں ستم ہیں — عاشق دیکھنے والے کے ہم ہیں

تاریکی میں حسن ہمارا
کہئے اب تک کس نے دیکھا

مخزن۔ مئی ۱۹۰۸ء

سرور جہاں آبادی

اندھی پھول والی کا گیت

لوگو چلو اِدھر ہے گلِ رعنا خرید لو — اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو
سنتی ہوں اس زمین کا منظر نظر فریب — پھر کس طرح نہ ہوں یہ گلِ تر نظر فریب
بچے یہ پھول بھی تو اسی سرزمیں کے ہیں — یہ ننھے ننھے لال اسی نازنین کے ہیں
یہ گل وہ گل ہیں انکی ادا ان گلوں میں ہے — رنگیں ادا ہیں بوئے وفا ان گلوں میں ہے
بازارِ حسن میں یہ گلِ تر ابھی ابھی — آئے ہیں ماں کی گود سے اٹھ کر ابھی ابھی
یہ بیٹھی نیند پر، گود میں تھے ماں کی سو رہے — ان پر نثار قطرۂ شبنم تھے ہو رہے
سوتا ہوا چمن سے اٹھا لائی ہوں ابھی — پھولوں کی انجمن سے اٹھا لائی ہوں ابھی
لوری تھی، خوابِ ناز کی موجِ ہوا نہ تھی — ماں کی دعا تھی، جنبشِ بادِ صبا نہ تھی
دلکش ہیں ان کے پھول سے رخسار کے نشاں — کچھ ماں کی مامتا کے ہیں کچھ پیار کے نشاں
آنسو ڈھلک رہے ہیں یہ جو چہرے پہ ماں کے ہیں — قطرے مگر یہ شبنمِ باغِ جناں کے ہیں
اِن آنسوؤں میں رنگِ محبت ہے جلوہ ریز — ان بوندیوں میں شعلۂ اُلفت ہے جلوہ ریز
بچوں کا غم خوشی میں بھی ہے، بدنصیب کو — کھٹکا لگا ہوا ہے یہ ہر دم غریب کو
یارب کہیں انھیں نہ کسی کی نظر لگے — ہیں نازنیں انھیں نہ کسی کی نظر لگے

ارمان نکالتی کبھی خوش ہو کے جی کے ہے
آنسو کبھی بہا کے یہ کہتی خوشی کے ہے

آغوشِ ناز سے مرے سو کر اٹھے ہیں یہ
شبنم سے ہاتھ منہ ابھی دھو کر اٹھے ہیں یہ

ہو کر بڑے اٹھے یہ حسیں کس غضب کے ہیں
جھڑتے ہیں پھول، خندۂ جبین کس غضب کے ہیں

رُوتی گلے لگا کے ہے بے اختیار ماں
کرتی ہے ان پہ قطرۂ شبنم نثار ماں

شبنم کی بوندیاں ہیں کہ آنسو یہ ماں کے ہیں
سرچشمۂ وفا ہیں یہ قطرے کہاں کے ہیں

تصویر خانہ ہے تمہیں لوگو، فضائے دہر
اور میں غریب اندھی ہوں ناآشنائے دہر

تاریک ہے یہ بزمِ تماشا مرے لئے
ظلمت کدہ ہے محفلِ دُنیا مرے لئے

آنکھوں بغیر سب ہیں مظاہر جہاں کے ہیچ
میرے لئے ہیں آہ مناظر یہاں کے ہیچ

دنیا کی صورتوں کو میں دکھیا ترستی ہوں
اجڑی ہوئی صداؤں کی منزل میں بستی ہوں

گویا قریبِ ساحلِ ظلمت کھڑی ہوں میں
محوِ تلاشِ جلوۂ حیرت کھڑی ہوں میں

سائے ہیں خوب و زشت گزرتے قریب سے
پنہاں مگر ہیں دیدۂ حسرت نصیب سے

نکلیں گی ان میں ایسی بھی دو چار صورتیں
صبر آزما، حسین، طرح دار صورتیں

صُورت پہ جن کی خلقِ خدا ہے مٹی ہوئی
ناز و ادا پہ جن کے قضا ہے مٹی ہوئی

وہ کیسی ہوتی ہونگی ترستی ہوں میں غریب
دیکھوں نظر اٹھا کے ہیں ایسے کہاں نصیب

میرا بجز صداؤں کے ہمراز کون ہے
ظلمت کدے میں مونس و دمساز کون ہے

لوگو چلو! مرے گلِ رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

کہتے ہیں کیا غریب یہ ان کی فغاں سنو
فریاد کو انھیں بھی ملی ہے زباں سُنو

اس اندھی پھول والی کا دم ہے ستم ہمیں
مُرجھا کے رہ نہ جائیں کہیں ہے یہ غم ہمیں

نازک ہیں، دھان پان ہیں، بچے ہیں نور کے
پروردۂ بہار ہیں ٹکڑے ہیں نور کے

ڈرتے ہیں اس دوشیزۂ ظلمت نشیں سے ہم
شورِ بکائے پیہم و آہِ حزیں سے ہم

آزاد اس کی قیدِ ستم سے کرے کوئی
دامانِ شوق میں ہمیں یارب بھرے کوئی

ہم دایۂ بہار کے نورِ نگاہ ہیں
آنکھیں اس اندھی لڑکی کی بے نور آہ ہیں

مشاق ہیں ان آنکھوں کے پروردگار ہم
جو ہم کو دیکھے، جن کو دکھائیں بہار ہم

لوگو چلو ابرِے گلِ رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

مخزن۔ مئی ۱۹۰۸ء

سید محمد ابراہیم اشک

اندھی پھول والی کا گیت

میں پھول بیچنے لائی ہوں لو، پریزادو
بن آنکھوں والی سے ان کو نجات دلوادو
جمال والو جمیلوں کی کچھ تو قدر کرو
یہ میرے ہاتھوں میں کملاتے ہیں انھیں لے لو
خریدو، کوڑیوں میں نور کے خزانے ہیں
نہیں ہیں پھول یہ قدرت کے چور خانے ہیں
میں سنتی ہوں یہ زمیں حسن میں نرالی ہے
نہیں ہے عین یقیں اور مجھے خیالی ہے
اگر یہ سچ ہے تو جو چیز جھولی والی ہے
بڑی ہے لاڑ سے گودوں میں اس نے پالی ہے
خریدو پھول یہ تازہ ہیں، آنکھ رکھتے ہیں
پرکھ لو تم تو پرکھنے کی ساکھ رکھتے ہیں
یہ ماں کی گود میں سوتے تھے میٹھی نیند ابھی
نسیم کرتی تھی دم پڑھ کے آیت الکرسی
جگا کے لے جو چلی میں تو ماں بلک اٹھی
کلی کلی مجھے دیتی دعا بد یہی رہی
زبانِ حال سے یوں کوستی رہی سوسن
کہ تیری آنکھوں میں دائم ہو پھول کا مسکن

چمن کے رشتہ سے یہ بچے ہیں عزیز ہم ہیں بعض ساں کے اکیلے تو شاذ ہیں توام
یہ بنتے کھیلتے پروان چڑھتے تھے پیہم شباب رنگ پہ آیا تو ہے مگر کم کم
ہیں ماں کی گود سے ان کو چھڑا کے لائی ہوں
بلک رہے تھے مگر یاں منا کے لائی ہوں

جہاں میں رہتی ہوں سنسان ساری بستی ہے عجیب دیس ہے دن کو بھی رات بستی ہے
تمھاری دید کو کیا کیا دکھی ترستی ہے غریب و بےکس و ناچار اپنی ہستی ہے
دکھی ہوں رنج و مصیبت کی جھیلنے والی ہوں
خدا کے ملکِ جلالی کی رہنے والی ہوں

مِری ہے عالمِ تاریک میں شریکِ آواز یہی غریب ہے ہر حال میں فقط دمساز
اسی کو عالمِ حس میں ہے میرے سوز و ساز نہ اور ناتہ کسی سے نہ کوئی محرمِ راز
حسب ضعیف، نسب بے نشاں، پریشاں نام
لقب اسیرِ دوام اور کنیتِ ناکام

میں سنتی ہوں کہ کوئی شے ہے حسن و رنگ و بشر کہ جس کے سامنے خیرہ ہے چشمِ شمس و قمر
کرشمہ اس کا غضب ہے ستم خدنگِ نظر چبھو دیا مرے دل میں خیال نے نشتر
یہ حسن و عشق کے چرچے جو تم چلاتے ہو۔!
یقین جانو کہ دل کو مرے جلاتے ہو

جگر کباب کی فریادِ زار تو سُن لو سکھی ہو تم تو دکھی کی پکار تو سُن لو
لگا کے کان گلوں کی گوہار تو سُن لو زبانِ گل سے صدائے بہار تو سُن لو
جو دل ہو سینے میں زندہ دلوں کی بات سنو
سنو تو اشک کی، کچھ دل جلوں کی بات سنو

مخزن۔ مئی ۱۹۰۸ء

اشک بلند شہری

اندھی پھول والی کا گیت

خریدو پھول میرے لینے والو   ذرا ان کی بہاروں کا مزہ لو!

یہ کہتی ہوں میں تم سے عاجزی سے   خریدو پھول تم دریا دلی سے
نہایت خوب صورت یہ زمیں ہے   سنا کرتی ہوں میں ہر آدمی سے
زمیں ہے خوب صورت گر یہاں کی   تو یہ سب پھول ہیں پیدا اسی سے
عیاں ہے حسن ان سے انکی ماں کا   پری پیدا ہوئی، گویا پری سے
یہ سارے پھول ہیں بچے اسی کے   نہیں کہتی ہوں تم سے دل لگی سے
یہ ماں کی گود میں سوتے تھے غافل   ابھی آئے ہیں اٹھ کر دو گھڑی سے
یہ میٹھی نیند یوں سوئے پڑے تھے   غرض ان کو نہ تھی گویا کسی سے
اٹھا لائی ہوں سوتوں کو یونہی میں   جدا بچے ہیں ماں کی ہم زمی سے
نسیم صبح پنکھا جھل رہی تھی   ملی جاتی تھی شبنم ہر کلی سے
نسیم ہوتی تھی قرباں چلتی کیا تھی   فدا یوں ہو رہی تھی لاکھ جی سے
دعا پڑھ پڑھ کے پھونکے جس طرح سے   کوئی ماں اپنے بچے پر خوشی سے

وہ ماں کی میٹھی میٹھی اُلفتوں کا / نشان ہے اُن کے ہونٹوں سے ہویدا
کھلی جاتی ہیں سب مارے خوشی کے / یہ ساری پنکھڑیاں پھولوں کی گویا
اسی آنسو سے یہ تر ہیں ابھی تک / عذارِ الفتِ مادر پہ جو تھا
کیا کرتی ہے رکھوالی شب و روز / رہا کرتا ہے اس کو فکر اُن کا
دھڑکتا ہے کبھی دل ان کے غم سے / بہاتی ہے کبھی رو رو کے دریا
نکلتے ہیں کبھی آنسو خوشی سے / کہ صدقے تیری قدرت کے خدایا
مِرے بچّے چڑھے پروان سارے / ہوئے سب حسن میں بے مثل و یکتا
کبھی روتی ہے سرگرم محبت / کبھی اُلفت سے آجاتا ہے رونا
نمایاں ہیں جو یہ قطراتِ شبنم / انھیں اشکوں سے وہ ہوتی ہے پیدا
انھیں اشکوں کا سرچشمہ ہے اُلفت / وہ اُلفت جس کا ماں رکھتی ہے اخفا

سُنا ہے میں نے اے لوگو یہ اکثر / یہ دُنیا ہے تمھاری نُور کا گھر
یہاں محبوب کے دل میں بھی گویا / مُحبّت زندگی پاتی ہے آکر
شبِ دیجور کی صورت مگر ہاں / رہا مجھ اندھی بے کس کا مگر گھر
فقط ہیں جس میں آوازوں کی گونجیں / نہ اس سے کچھ زیادہ اور نہ کمتر
اندھیرے میں زمیں کے نیچے گویا / مصیبت اور غم کے اے خر دور
بہی جاتی ہیں کالی کالی ندیاں / کھڑی ہوں میں کنارے کے برابر
گزر جاتی ہیں سب پرچھائیاں سی / بری اچھی یہاں سب پاس ہوکر
نظر آتی نہیں صورت کسی کی / سُنا کرتی ہوں باتیں ان کی اکثر
انھیں میں ہوں گی ایسی صورتیں بھی / انھیں میں ہوں گے ایسے ماہ پیکر
کشش ہوتی ہے جن کی صورتوں میں / ہوا کرتا ہے جن سے عشق اکثر

خدا جانے وہ کیسی ہوتی ہوں گی
تصور تک نہیں آتا ہے دل پر
ترستی ہوں میں ان کے دیکھنے کو
عیاں ہوتے ہیں جوشِ قلبِ مضطر
صدا پھیلائے میں نے جوش میں ہاتھ
کوئی پرساں نہیں اللہ، اکبر
وہی مجموعۂ اصوات دن رات
وہی آواز خالی خولی اکثر
مرے نزدیک سب اشیاء جاں دار
نہیں آلودۂ جسم مکرر
نہیں رکھتی یہ سب پرچھائیاں جسم
فقط آواز کا ہے ان میں جوھر

چلو لوگو خریدو پھول میرے
سجا لو ٹوپیاں ہاتھوں میں ڈالو

سنو لوگو یہ پیاری پیاری جانیں
ذرا دیکھو کہ کیا کیا کہہ رہی ہیں
زباں ان کو ملی ہے بہرِ فریاد
جو یوں کرتے ہیں سب دلدوز آہیں

چلو لوگو خریدو پھول میرے
بھرو چنگیریاں میزیں سجا لو

سُنو اے دوستو غم کھا رہے ہیں
ہم اپنی جان سے تنگ آ رہے ہیں
تمھیں سب حالتیں دکھلا رہے ہیں
سب آپ ہی آپ ہم مرجھا رہے ہیں
یہ لڑکی سانس لیتی ہے برابر
ہم اس کے سانس سے کمھلا رہے ہیں
ہم آخر پھول ہیں نازک ہیں اتنے
کہ بچے نور کے کملا رہے ہیں
زمیں کے ناز پروردہ ہمیں ہیں
ہم اُس کی قید میں گھبرا رہے ہیں
یہ لڑکی ساکنِ ظلمت ہے گویا
ہم اس کے ساتھ ہولیں کھا رہے ہیں
کیا ہے قید اُس اندھی نے ہم کو
بڑی آفت میں ہم سب آ رہے ہیں

ہمیں آزاد کر دو، صاحبو تم — اندھیرے گھر میں ہم گھبرا رہے ہیں
اور ان آنکھوں کی ہے ہم کو تمنّا — حسیں جن کے لئے للچا رہے ہیں
انھیں لوگوں کے ہیں مشتاق ہم تو — جو ہم کو دیکھنے کو آ رہے ہیں
اندھیرے میں ہمارا حسن یارو — نظر آتا نہیں گھبرا رہے ہیں
جمال و حسن کے شیدا تمہیں ہو — تمھیں ہم اس لئے پرچا رہے ہیں
تمھارے دیدۂ روشن عزیزو — فلک کو ماہ پر مشر ما رہے ہیں
بنے ہیں مطلع مہرِ درخشاں — جمال اپنا ہمیں دکھلا رہے ہیں

چلو لوگو خریدو پھول میرے — دکھا لو، دیکھ لو، گہنے بنا لو

مخزن۔ مئی ۱۹۰۸ء

سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی

اندھی پھول والی کا گیت

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول

تم ہو جس دنیا کے ساکن، نور کی دُنیا ہے وہ
عالمِ ظلمات مجھ مجبور کی دُنیا ہے وہ

ہو مبارک تم کو دنیا کے نظارے دیکھنا
دن کو نُورِ مہر شب کو چاند تارے دیکھنا

میں وہاں ہوں، ہے اندھیرا گھُپ جہاں چھایا ہوا
ہے تصور اس سیہ خانہ میں گھبرایا ہوا

تم کو قُدرت نے عطا کی قوتِ نظارگی
اور میں محرومِ قدرت بندگی بیچارگی

نظمِ دنیا کا ہے جامِ جم تمہارے واسطے
تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے

فلسفہ قدرت کا ان پھولوں میں دکھلاتی ہوں میں
ان میں جو جو خوبیاں ہیں تم کو سمجھاتی ہوں میں

طفلِ غنچہ بڑھ کے یہ آزاد گل بوٹے ہوئے
آ گئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے

وہم ہے نقش و نگارِ گل غلط ہے یہ گماں
عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسوں کے نشاں

باعثِ عبرت ہے اُن کا عالم افسردگی
مادرِ گیتی سے چھٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازپروردہ چمن ہیں یہ جوانانِ چمن
حُسن کی دنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن

کل کے دن تک تھے یہی سب طرہ و دستارِ باغ
ان کی رونق دیکھتی تھی نرگسِ بیمارِ باغ

جب ہوئے پورے جواں تو ہو گئے عاشق مزاج
اب خود ان کو صاحبانِ حسن کی ہے احتیاج

آرزو یہ ہے کسی کی طرۂ دستار ہوں
خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں

باوفا خود ہیں اور ہر حالت میں یہ دلسوز ہیں
اور حسینوں کو اتالیقِ وفا آموز ہیں

ہم دم راحت بھی ہیں اور غم گسارِ غم بھی ہیں
رونقِ شادی شریکِ محفلِ ماتم بھی ہیں

صرفِ بزمِ عیشِ معشوقِ ستم ایجاد بھی
اور کبھی زیبِ مزارِ عاشقِ ناشاد بھی

لو خریدارو چلو، یہ بے رخی اچھی نہیں
رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو اچھی نہیں

خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کے لئے
اپنے گھر لے جاؤ اِن کو مہمانی کے لئے

مخزن۔ جون ۱۹۰۸ء

قیصر

سمندر

اے سمندر گہرے اور نیلے سمندر، مہرباں
تو بہے جا اور بہائے جا ہزاروں کشتیاں

تجھ پہ ہیں بیکار بہتی کشتیاں کیوں اس قدر
فخر تجھ پہ کر رہے ہیں بادباں کیوں اس قدر

چاہتا ہے جس طرح کرنا ہے انساں کو خراب
اس زمیں کو بخشتا ہے ہر طرح لطفِ شباب

ختم انساں کی حکومت ہے کناروں پر ترے
ختم اُس کی ساری شوکت ہے کناروں پر ترے

کام اس میدانِ آبی میں ہے تیرا چار سو
ایک دنیا کی تباہی اور بربادی ہے تو

تجھ پہ اے انساں نہیں چلتا ہے کچھ انساں کا بس
بلکہ ہو جاتا ہے وہ خود ہی فنا، کر کے ہوس

ایک لمحے میں وہ قطرے کی طرح نیچے چلا
رنج و غم کے ساتھ وہ گہرائی میں تیرے چلا

قبر، میت اور جنازہ اور نماز اس پر کہاں
غرق ہو جاتا ہے وہ ایسا، نہیں ملتا نشاں

تیری انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے کچھ عناں
کر نہیں سکتا ہے وہ غارت تری کچھ کھیتیاں

تیری موجیں اٹھ کے خود اس کو پریشاں کرتی ہیں
تیری لہریں پھیل کر خود اس کو حیراں کرتی ہیں

اس کی وہ طاقت زمیں پر آزماتا ہے جسے
تیری نظروں میں نہیں وقعت ذرا بھی رکھتی ہے

اپنے سینے سے اسے اک بارگی کر کے جُدا
اک حقارت سے فلک کی سمت تو ہے پھینکتا

بھینچتا ہے خوب ہی آغوش میں اس کو بٹھا اڑنے والی موجوں کے قطروں سے ہے وہ دیکھتا
مانگتا ہے وہ مدد اپنے خدا سے ہر گھڑی جس سے یہ تھوڑی سی امید اسکے دلکو ہے لگی
اس کو پہنچا دے گا وہ اچھی سی بندرگاہ میں تاکہ آجاوے مدد کو اس کی کوئی راہ میں
پھینکتا ہے پھر زمیں کی سمت تو کرکے فغاں چھوڑ کر اپنی جگہ آجاتا ہے اس کو دہاں

توڑتے ہیں جو چٹانوں کی زمینیں وہ جہاز ڈالتے ہیں زلزلہ قوموں کے دلمیں وہ جہاز
بادشہ کانپ اٹھتے ہیں جو سُن لیتے ہیں نام مفت اور بیکار کرتے ہیں وہ اس مالک کا کام
جو کہ مٹی سے بنا ہے اور پھر مٹی میں ہے فیصلہ کن جنگ کا فاتح بناتے ہیں اسے
ہیں کھلونے کی طرح سینے پہ تیرے یہ جہاز ناچتے پھرتے ہیں تجھ پر کیسے کیسے یہ جہاز
تیری موجوں میں پگھلتی برف کی ہیں جب تہیں ملک جو مغرور ہیں نقصان انھیں پہنچاتی ہیں

بستیاں تیرے کناروں پر بسی ہیں اور ہیں تو نہیں بدلا مگر وہ مل گئیں سب خاک ہیں
ہیں کہاں یونان، روما، کارتھیج اور اور ملک جبکہ طاقتور تھے اور آزاد تھے ہر طور ملک
کردیا پانی نے تیرے اون کا نشاں ظالموں کا تیرے ہاتھوں سے نہیں پایا نشاں
رہ گیا تاریخ کے صفحات پر بس ان کا نام غیر ملکی اور وحشی ان کے ہیں قائم مقام
آیا جب ادبار ملکوں پر تو وہ ویراں ہوئے اور ویراں بھی ہوئے کیسے کہ ریگستاں ہوئے
کوئی تبدیلی نہیں پائی مگر تجھ میں کبھی ہاں اگر کرتا ہے تو موجوں سے اپنی دل لگی
تو تری حالت بدل جاتی ہے تھوڑی دیر تک ورنہ ہم نے تو نہیں دیکھا ہے جھپکی ہو پلک
نیلی ابرو پر ترے دیکھا نہیں کوئی نشاں بہ رہا ہے اب بھی تو ویسا ہی، پہلے تھا جہاں
آفرینش کی سحر نے جیسا دیکھا تھا تجھے تیری موجیں ویسی ہی ہیں ویسا ہی پایا تجھے
ایسا آئینہ ہے جس میں صورت آتی ہے نظر قادرِ مطلق کی، جو ہر بھیس میں ہے جلوہ گر

تجھ میں ہو طوفاں برپا، یا کہ تو ساکت رہے
اور ہوا یا تیز یا دھیمی بہرصورت رہے

کچھ ہو لیکن جانتے ہیں مظہرِ قدرت تجھے
اہلِ دنیا جانتے ہیں مظہرِ شوکت تجھے

برف سے گر جاتی ہیں قطبین جب گرتا ہے برف
کالی کالی موجوں کا ہے گرم ملکوں ہی میں صرف

تو ہے بے پایاں تری حد ہم کو ہے معلوم کیا
تو ہے تصویرِ ابر، اور رونقِ تختِ خدا

ہوتے ہیں پیدا تری کیچڑ سے تیرے جانور
منطقاتِ ارض میں تو ہر جگہ ہے جلوہ گر

تجھ میں جب تحریکِ سیلابِ بلا ہونے لگی
پھر تو دہشتناک تیری ہر صدا ہونے لگی

اے سمندر جب رواں ہوتے ہیں تیرے آبشار
مجھ کو آتی ہے محبت تجھ پہ، اور آتا ہے پیار

تیرے سینے پر منقش ہے وہ مانند حباب
وہ خوشی کھیلوں کی میری جو تھی ہنگام شباب

کھیلتا تھا میں لڑکپن میں تری موجوں کے ساتھ
وہ بڑھاتی تھیں خوشی کو میری کیا کیا ہاتھوں ہاتھ

تیرا جزر و مد اگر مجھ کو ڈراتا تھا کبھی
تو یہ وہ دہشت تھی جس سے دل کو ہوتی تھی خوشی

کیوں کہ میں تھا تیرے بچے کے برابر اس لئے
کھیلنے میں تیری موجوں پر بھروسہ تھا مجھے

ہاتھ رکھ دیتا تھا اپنا، دیکھ کر تیری ایال
اس طرح، پھر بھی نہ تھی قابو میں میری تیری چال

ممتاز احمد

سمندر

موجزن رہ موجزن بحرِ کبودِ بے کراں — بے اثر تجھ پر پھرا کرتی ہے لاکھوں کشتیاں
گو زمیں پر آدمی کا کام ہے غارت گری — تیرے ساحل سے ادھر لیکن حکومت ہے تیری
نقش پانی پر جو ہیں تیرے تباہی کے عیاں — اُن سے پر ظاہر ہیں تیری طبع کی جولانیاں
تجھ میں انسان نہیں غارتگری کا کچھ نشاں — ہاں مگر وہ خود تبہ ہوتا ہے تجھ میں بے گماں
مثلِ قطرہ غرق ہو جاتا ہے کھو کر جانِ زار — بے کفن بے گور بے تابوت بے لوحِ مزار

وقت کا تجھ پر اثر ہوتا نہیں ارزق جبیں
تو شناسائے تغیر آفرینش پر نہیں

مخزن۔ مئی ١٩١٤ء

غلام محمد طور

کوئل

خوش خبرا طائرِ نو واردِ زیبا کوئل　　تو نے بچپن سے مجھے کو کو سنایا کوئل
تجھ کو طائر کہے اے میرے دل آرا کوئل　　یا کہ آوازِ پریشاں ترا شیدا کوئل

گھاس کے فرش پہ جب لیٹتا تھا میں جا کر　　دل پہ کرتا تھا ترنّم ترا جادو کا اثر
کیا ترنم تھا کہ با سرعتِ برقِ مضطر　　کوہ و میداں میں ہوا جاتا تھا جلوہ گستر

ہیچ مانا کہ تجھے وادیٔ گل ہے بھاتی　　عشق کی بو ترے نغموں سے ہے پیہم آتی
کوک تیری ہے مری یاد میں لیکن لاتی　　میری طفلی جو نہیں خواب میں بھی اب آتی

خیر مقدم ترا اے قاصدِ ایامِ بہار　　گوش شنوا کو سنا، معنیٔ پیغامِ بہار
تو پرندہ نہیں اے طائرِ ہنگامِ بہار　　بلکہ پوشیدہ کوئی ہستیٔ سرِ بامِ بہار
جو مغنّی بھی ہے مطرب بھی گوّیا بھی ہے　　جو ہے معشوق بھی اور عاشقِ شیدا بھی ہے

تو مغنّی ہے وہی ہائے تو مطرب ہے وہی
عہدِ مکتب میں صدا بھاتی تھی مجھکو جس کی
تو گویا ہے وہی جس کی طلب جب ہوتی
کوششیں ہوتی تھیں ناکام ہزاروں میری

میں نے ڈھونڈا تجھے ہر چند نہ پایا کوئل
سبزہ زاروں کو کیا گوشہ و بالا کوئل
تو وہ امید ہے اے میری دل آرا کوئل
جس کا دیکھا نہ کسی شخص نے چہرا کوئل
تو وہ معشوق ہے ہے حقا کوئل
جستجو کر نہ سکی جس کا نظارا کوئل

گرچہ طفلی نے کیا مجھ سے کنارا کوئل
تیرا نغمہ ہے مرا اب بھی سہارا کوئل
ہائے زریں زمانہ وہ پیارا کوئل
پھر بھی پا سکتا ہوں بتلا تو خدارا کوئل

ہو مبارک تجھے اس ہستی کا نقشا کوئل
حسبِ منشا ہے مگر تیرے یہ طبقا کوئل
ہم تو کہتے ہیں خیالی ہے یہ دنیا کوئل
تو خیالی کی پرستار ہے شیدا کوئل
ہاں خیالی کو خیالی پہ مچل جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مخزن۔ اپریل ۱۹۰۹ء

عظمت اللہ خاں

کوئل

خوشا مست آواز والے پرندے   تری کوک خوشیوں کی اک راز ہے
پرندہ کہوں، یا تو بچپن کی میرے   بھٹکتی ہوئی سی اک آواز ہے

تری تانیں اونچی، میں سنتا ہوں لیٹا   ہوا گھاس پر گو تو مستور ہے
تری کوک سے بن کا بن گونج اٹھا   ابھی پاس ہے اور ابھی دور ہے

سناتی ہے بن کر سریلی کہانی   تو پھل پھول کو دھوپ اور چھاؤں کی
یہ آواز تیری ہے مجھ میں جگاتی   لڑکپن کی گھڑیاں وہ اک خواب سی

خوشا اے تو فطرت کے موہن پرندے   تو میرے لڑکپن کی دمساز ہے
پرندہ نہیں تو تصور میں میرے   اک آواز ہے اب بھی اک راز ہے

وہی ہے تو آواز اسکول جاتے — مِرے کان میں پڑ گئی بس جہاں
ہزاروں طرف آنکھ نے چھان مارے — درخت اور جھاڑی زمیں آسماں

لڑکپن میں تیرے لئے خاک چھانی — گھنے بن کی، میدان کی، کھیت کی
پر اے دل رُبائے تمنائے طفلی — بہت ڈھونڈا، دیکھا نہ پایا کبھی

تجھے سُن کے ہوں اب بھی کھویا سا جاتا — عجب دن سروں میں ہے جادو بھرا
کہ آنکھوں میں لہرانے لگتا ہے سارا — زمانہ وہ انمول، بچپن مِرا

مبارک پرندے یہ دکھیاری دھرتی — نظر میں مری پھر ذرا کی ذرا
پرستان ہے یا تخیّل کی نگری — تری آشیانہ کی موزوں جگہ

اُردو۔ جولائی ۲۲ ۱۹ء

برقؔ دہلوی

ساعتِ مرگ

آتی ہے وقتِ خاص پہ گلزار میں خزاں
ڈھلنے کا فصلِ گل کے مقرر ہے اک سماں

تارے ہیں تا ظہورِ سحر زیب آسماں
پابندِ وقت کب ہے مگر مرگِ ناگہاں

دن بھر ہیں کاہشیں بسر اوقات کے لئے
ہوتی ہے شام لطفِ ملاقات کے لئے

طاعت کے خواب کے ہیں مزے رات کے لئے
ہر آن ہے اجل تری آفات کے لئے

معلوم ہے گھٹے گا مہہ تابدار کب
اور آئیں گے طیور سمندر کے پار کب

حاصل کرے گی، رنگِ خزاں کشتِ زار کب
پر کیا خبر کہ تیرا کریں انتظار کب

کیا تیری وہ گھڑی ہے کہ جب بادِ نوبہار
پھولوں کو گدگداتی ہے شوخی سے بار بار
یا جب کہ گل کو ملتا ہے پژمردگی کا فار
ان سب کا ایک وقت ہے لیکن ترے ہزار

تو ہے وہاں بھی موج اٹھاتی ہے بحر جہاں
یا ہے لبِ نسیم پہ نغمہ جہاں رواں
تو ہے ہمارے گوشۂ راحت میں بھی نہاں
دنیا میں تجھ سے کچلے اجل، جائیں ہم کہاں

اس جا بھی تو ہے ملتے ہیں دو غم زدہ جہاں
ہونے کو زیرِ سایۂ اشجار تازہ جان
تو اس جگہ بھی ہے کہ جہاں تیغ خوں فشاں
تاجِ شہی کی دن میں اڑاتی ہے دھجیاں

مارچ ۱۹۲۲ء

تلوک چند محروم

موت کا موسم

موسمِ خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں
پھول مرجھاتے ہیں جب باغ میں آتی ہے خزاں
صبح کے ہونے پہ ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت مقرّر ہے ترا وقت کہاں

دن کو ہوتا ہے ہر اک کو غمِ دُنیا سے کام
دوست مل جائیں بہم آتی ہے اس واسطے شام
رات ہوتی ہے کہ ہو سب کو میسّر آرام
لیکن اے موت ترے آنے کے ہیں وقت تمام

ہم کو معلوم ہے کب بدر کو ہونا ہے ہلال
اڑ کے کب جانا پرندوں کو ہے پھر سوئے شمال
ہونا گلشن کو ہے کب بادِ خزاں سے پامال
کون بتلائے کہ کب کیجئے ترا استقبال

کیا وہ موسم ہے ترا جب کہ بہار آتی ہے
اور صبا حسنِ گلِ تر کو نکھار آتی ہے
یا کہ جب بادِ خزاں لے کے غبار آتی ہے
نہیں ہر فصل میں تو بہرِ شکار آتی ہے

بحر و بر دونوں کو منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوا میں بھی ہے طاقت تیری
دل سے راحت میں بھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہے صورت تیری

تو وہاں بھی ہے جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دکھڑے رونے کے لئے بیٹھ کے زیرِ اشجار
تو وہاں بھی ہے جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور جوہر ہے جہاں اپنے دکھاتی تلوار

حامد اللہ افسر

آئینہ میں سفید بال دیکھ کر

یہ کیا ہو گیا کیا نظر ہو گئی — سرِ شام کیوں کر سحر ہو گئی
بس آئینے یوں مجھ کو دھوکا نہ دے — نہ دے اس طرح دل کو چرکا نہ دے
ابھی سے میں ہوتی کہن سال کیوں — بھلا ایسے ہوتے مرے بال کیوں
جوانی کا باقی ابھی دور ہے! — سفیدی نہیں یہ تو کچھ اور ہے
ستایا تھا نزلے نے جواب سے دور — اُسی گھر گئے کا ہے شاید فتور
ملیں گے کہاں اب مجھے ایسے بال — نہ جی میرا کیوں کر بھلا ہو نڈھال
کسی کو رہا خوب کالے کو کیا — بنے گا بھلا جال گالے کا کیا

جوانی پہ بالوں کا کیوں ہو اثر — سفیدی سیاہی پہ کیوں ہو نظر
اگر ولولے دل میں باقی رہیں — جواں کیوں نہ انساں کو ہم کہیں
جوانی تو دل میں رہتی ہے نہاں — اگر دل جواں ہے تو ہم ہیں جواں

مگر ہائے کب دل بہلتا ہے یوں — حقیقت عیاں ہے میں کچھ بھی کہوں
نہ میں ہوں جواں اور نہ دل ہے جواں — جوانی گئی اب جوانی کہاں!

طالب بنارسی

پہلا سفید بال

اک گال پہ ہاتھ دھرے بیٹھی، اک ہوش ربا رعنائی تھی
آئینہ آگے رکھا تھا رُخ پر حیرانی چھائی تھی
مہتاب سے مکھڑے پر اُس کے غم کی بدلی گھر آئی تھی
سہمی، سوکھی اوسان خطا مضطر ششدر گھبرائی تھی
آئینہ سے چار آنکھ ہوئی تو چوٹی کا یہ بھید ملا
ہے ہے اس مہوش کے سر میں اک پہلا بال سفید ملا

گو عمر ڈھلی تھی لیکن پھر بھی سُرخی تھی رُخساروں پر
چکنائی گالوں پر چھائی، یا روغن تھا انگاروں پر
وہ گیسو چوٹ کیا کرتے تھے کاکل کے بیماروں پر
تھے جتنے خالِ سیہ تن میں سب چشمک زن تھے تاروں پر
چہرہ اترا تھا غیض چڑھا تھا لرزہ تن میں آیا تھا
غم چاند سے رُخ پر چھایا تھا یا چاند گہن میں آیا تھا

کہتی تھی بھر کر آہ الٰہی یہ کیا ستیاناس ہوا
جو سنبل نافہ عنبر تھا وہ سنبل آخر گھاس ہوا
یہ مشک مرا کافور بنا دل آج اسیرِ یاس ہوا
لائے ہونگے کالے بالوں کے اب یہ نیا وسواس ہوا
جو زلف رسا کہلاتی تھی کیا اب وہ رسن کہلائیگی
کیا آج جوانی چل نکلی، کیا اب سے ضعیفی آئیگی

وہ گیسو جو ہمراہ ہوا کے ناگن سے لہراتے تھے وہ بال جو بچپن میں بکھرے پر اڑ ناگن کہلاتے تھے
وہ بال ہلا کے جنکے بل پر پیچ ہزاروں کھاتے تھے انکی خوبی میں بل آیا جن پر سب بل بل جاتے تھے

اڑ جائے نگوڑی پیری مجھ کو دینے داغِ جگر آئی
اس میری شام جوانی کی کیا اتنی جلد سحر آئی

اس لٹ میں دنیا اٹکی تھی اور زنار اسی کو کہتی تھی مخلوق اسی کی ماری تھی اور مار اسی کو کہتی تھی
کل مار پھرے مارے مارے خونخوار اسی کو کہتی تھی مشکیں، آشفتہ، سرکش، سنبل مار اسی کو کہتی تھی

جس جوبن پر مغرور تھی میں وہ آخر کار نہ کام آیا
سر کا اک بال سفید ہوا اور مرنے کا پیغام آیا

کافر اس حلقہ میں پھنس کر زنار اسی کو کہتے تھے نافہ، عنبر، ظلمات، ختن تاتار اسی کو کہتے تھے
اچھے اچھے اس پر مر کر بیمار اسی کو کہتے تھے جادوگر، پرفن، پیچیدہ، طرار اسی کو کہتے تھے

وہ کون سا ایسا دل تھا جو اس بحر میں غرق نہ تھا
اس دام میں کتنے الجھے تھے اور اس میں سرِ مو فرق نہ تھا

میں باغ گئی تو نرگس مجھ سے دم بھر آنکھ لڑا نہ سکی کوئی بلبل میری نغمہ سنجی کے مقابل آ نہ سکی
سوسن کی زباں تعریف کی میری تاب ذرا بھی لا نہ سکی دانتوں سے میرے پیش کبھی کبھی کسی دن جا نہ سکی

دانا بھی میرے حسن ادا کا شیدا تھا دیوانہ تھا
وہ گیسو دام تھے جن میں ہر رخسار کا ہر تل دانا تھا

کیا بال کا باندھا حسن سرا اب چلنے کو تیار ہوا کیا چوٹی کے جوبن کو میرے سر تن سے انکار ہوا
یارب یہ کیا بد فال آیا کس دشمن کا دیدار ہوا جو میرے سر پر چڑھ کر مری خوبی کا آزار ہوا

ہیہات غضب کیا مجھ کو کہے گا شوخ نگار نہ اب کوئی
افسوس ستم کیا مجھ کو کرے گا دل سے پیار نہ اب کوئی

کچھ سوچ کے دل کو ڈھارس دی پھر یہ سخن لب پر لائی تین طاق ہوا ب بھی حسن ہیں مرے شان میں کیا خفّت آئی
ناحق ہے خیالِ خام مجھے، ناحق کو طبیعت گھبرائی اک بال جو پکا بھی تو موجود ہے اب بھی رعنائی
خورشید کو دعویٰ حسن کا ہو تو چرخ سے آج اتر آئے
مہتاب کو غرّہ ہو تو میرے آگے آتے ادھر آئے

ناگاہ ندائے غیب آئی، ہاں اے ہوش بیزار نہ ہو رفتارِ زمانہ دیکھ کے چل اسکی شاکی زنہار نہ ہو
گلزارِ جہاں میں کونسا گل ہے جو مرجھا کر خار نہ ہو تو دل کو اپنے ڈھارس دے بیکار الم میں خوار نہ ہو
جب زیست گھٹی اور عمر بڑھی تو اور بڑائی پائے گی
جو خام خرد کہلاتی تھی وہ پختہ سر کہلائے گی

جو غازہ تیری زینت تھا اب دے وہ اپنی دختر کو اپنے افشاں سے چن دے اپنے لہو کے چہرۂ انور کو
اولاد کو اپنی پہنا دے تو اپنے سارے زیور کو اب دیکھ نہ بہتِ ابرو کو، اب دیکھ تو اپنے گھر بھر کو
بیٹی بہوؤں میں بڑائی کا یہ تجھ کو آج نوید ملا
اے ہوش کیا غم ہے سر میں گر پکا بال سفید ملا

مخزن ۔ مئی ۱۹۰۶ء

نازؔ

موت اچھی کہ زندگی اچھی

موت اچھی کہ زندگی اچھی — فکر بھی دل کو کیا لگی اچھی

آیا افضل یہ ہے کہ ہوں پیہم — ہدفِ ناوکِ سنانِ الم

آشنا ہوں غمِ دروں کے ساتھ — صلح جو بختِ واژگوں کے ساتھ

یا کریں ان سے جنگ کا آہنگ — تا ہو یک لخت ان پہ عرصہ تنگ

مٹے دُنیا سے بجزِ غم کا نشاں — غم سے ہووے غمِ نہاں پنہاں

چرخ کو چکر اور فزوں ہو جائے — بارِ خجلت سے سرنگوں ہو جائے

موت بس اک خوابِ غفلت ہے — خواب میں کب امیدِ راحت ہے

نیند درمانِ حالِ بسمل خوب — التیامِ جراحتِ دل خوب

چارۂ صدمہائے جاں معلوم — دفعِ سوزِ دلِ تپاں معلوم

زیرِ تربت اگر ہو کچھ آرام — موت کی ہوں دعائیں صبح و شام

موت اگر ایک شکلِ خواب ہی ہے — تو بھی اک دل کو اضطراب ہی ہے

خواب اس خواب میں خدا جانے — کیا پریشاں کریں خدا جانے

ایک اندیشہ ہے یہی دل کا — جو نگہبان جانِ بسمل کا

فرصتِ غم کو طول اسی سے ہے — غم بشر کو قبول اسی سے ہے
یوں تو ہونے کو دم میں ہوتا ہے — جامۂ تن جُدا تنِ جاں سے
ورنہ کس کو پڑی اٹھانے کی — خفت و سختیاں زمانے کی
کیوں سہیں ظلم حاکم ظالم — کیوں سہیں طعنِ بخشش منعم
کیوں ہو محرومئ وصالِ یار — باعث بے قراریٔ دلِ زار
کیوں اٹھائیں غمِ توقفِ عدل — کیا غرض ہم کو ہو تاسفِ عدل
شوخئ اہلکار کیوں دیکھیں — نفرتِ نابکار کیوں جھیلیں
بیشتر مردمانِ عجز شعار — شرِ نااہل سے ہیں سینہ فگار
جن کی بدکاریوں سے شکلِ نجات — خنجرِ آبدار کے ہے ہات
کیوں اٹھائیں غمِ جہاں کوئی — کیوں کرے نالہ و فغاں کوئی
دردِ جانِ نزار کون سہے — سختیٔ روزگار کون سہے
مگر اندیشۂ دیارِ عدم — کہ نہ معلوم واں بھی ہو تپِ غم
دلِ انساں کو کرتا ہے حیران — باز رکھتا ہے اس کو کھونے سے جان
کون آیا یہاں مکینِ عدم — کہتا جو حالِ سرزمینِ عدم
اسی اندیشے سے نہیں مرتے — قصدِ ملکِ عدم نہیں کرتے
جب خبر ہی نہیں ہے کچھ واں کی — جھیلتے ہیں مصیبتیں یاں کی
اسی اندیشہ نے کیا بزدل — اسی اندیشے سے ہے جاں بسمل
کر دیا پست حوصلہ دل کا — ہوش باقی رہا نہ عاقل کا
دلولہ قطع ہو گیا دل کا — قصۂ جانا رہا مراحل کا
چشمۂ آرزو کا رُخ جو پھرا — نام عنقا ہوا روانی کا

سخت است ناز اگرچہ جاں دارد
نوکِ صد خار غم نہاں دارد

حمید عرفانی

زندگی اور موت

(ہملٹ۔ انتہائی یاس کے عالم میں)

طلسمِ بود و نبودِ حیات کیا شے ہے
عدم سے دور ہوں ہستی سے بھی گریزاں ہوں
یہ کم نصیب جہاں رنج و غم کی بستی ہے
ہے شور آہ و فغاں ہر طرف پریشاں ہوں

ستم تو یہ ہے کہ جیتے ہیں زندگی کے لئے
وہ زندگی کہ جو لذتِ کشِ جنوں بھی نہیں
ستم ہے ظلم ہے بارِ الم ہے گردن پر
مگر ہمیں خبرِ حالتِ جنوں بھی نہیں
یہی تڑپ ہے کہ دُنیا کو لالہ گوں کر دیں
مگر رگوں سے عیاں اک شرارِ خوں بھی نہیں

یہ سچ ہے ہم کو مقدّر پہ اختیار نہیں
کچھ اپنے دست و گریباں پہ اختیار تو ہے
جہانِ رنج و الم سے رہِ گریز نہیں
تو اپنے خنجرِ براں کی تیز دھار تو ہے

فریب کھاتے ہیں اور اپنا خون پیتے ہیں
کوئی بتائے کہ کس آرزو پہ جیتے ہیں

(فضا میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اور پھر دور سے نغمہ بلند ہوتا ہے۔ اور آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے)

عدم کیا ہے؟ سکوتِ مرگ کا خوابِ گراں کیا ہے؟
ہماری منزلِ مقصود کا آخر نشاں کیا ہے؟
نہ لوٹا آج تک اس منزلِ موہوم سے کوئی
خلش دل میں رہی باقی کہ یہ رازِ نہاں کیا ہے
نہیں معلوم جب تجھ کو متاعِ زندگی اپنا
تو اے ناداں متاعِ درد کی لذت گراں کیا ہے
سرابِ آرزو سیراب کرتا ہے نگاہوں کو
تجھے اس سے غرض کیا منتہائے دین داں کیا ہے
یہ مانا بارشِ رنج و الم ہے اہلِ گیتی پر
کسے معلوم بالائے رودلائے آسماں کیا ہے
تجھے اس سے غرض کیا منتہائے دین و آں کیا ہے

(آواز مدھم ہوتی جاتی ہے اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے)

غلام محمد طور

فلسفۂ محبت

چشموں کو ہے اشتیاقِ دریا
دریاؤں کو بحر کا ہے سود
امواجِ ہوائے دہر ہر دم
چاہت سے ہیں ہم کنار باہم
جگ بھر میں کوئی نہیں ہے خالی
ہر چیز کو ہے لگن کسی کی
قدرت کا ہو میری جان یہ قانون
ہو مجھ سے نفور تو ہے موزوں

اونچے اونچے پہاڑ سارے
ہاں بوسہ ستاں سبھی فلک کے
امواج میں بحر کی ہے کیا جوش
ہیں عشق سے ہو رہی ہم آغوش
اس گل کو کہے گا کون اچھا
الفت نہ گلوں سے جو کرے گا
کس پیار سے نورِ مہرِ تاباں
ہوتا ہے زمیں پہ روز قرباں
کس شوق سے ہائے ماہِ شبتاب
ہوتا ہے نثارِ طبقۂ آب
اس بوس و کنار سے غرض کیا
گر پیار نہ مجھ سے تو کرے گا

مخزن۔ جولائی ۱۹۱۱ء

سید ابوالحسن ناطق

راز الفت

ملتے ہیں چشمے ندی سے آن کر — اور ملتی ہے سمندر سے ندی
سب ہوائیں ملتی بایک دگر — ایسے دل سے جس میں الفت ہو بھری

رہتی ہے بے لوث کوئی چیز کب — بستہ سب قانون سے قدرت کے ہیں
ایک ہو جاتی ہیں باہم مل کے سب — کیوں نہ مل جاؤں بھلا پھر تجھ سے میں

چومتا ہے چرخ کو کوہِ بلند — اور لہریں ملتی ہیں باہم گلے
ہم چنبیلی کو کریں گے ناپسند — باغ میں بیلے سے گر نفرت کرے

لوٹ ہے دریا کے اوپر چاندنی — دھوپ ہے اور بوسۂ روئے زمیں
یہ محبت ان کی ہے کس کام کی — تو ہی مجھ کو پیار جب کرتا نہیں

مخزن۔ نومبر ۱۹۰۸ء

شانُ الحق حقّی

فرصت

کیا یہ بھی زندگی ہے، الجھی ہوئی غموں میں
فرصت نہیں کہ ٹھہریں، کچھ آنکھ بھر کے دیکھیں

فرصت نہیں کہ گھوریں دم بھر فضائیں خالی
کرتے ہیں ڈھور ڈانگر کس چین سے جگالی

فرصت نہیں کہ دیکھیں راہوں میں جاتے جاتے
میوے گلہریوں نے رکھے کہاں چھپا کے

فرصت نہیں کہ ٹھٹکیں رستے میں لحظہ بھر کو
گر کوئی ماہ پیکر کھینچے کبھی نظر کو

فرصت نہیں کہ ٹھٹکیں گر آنکھ مل بھی جائے
اتنا کہ مسکراہٹ آنکھوں سے لب تک آئے

فرصت نہیں کہ دیکھیں دن کو ندی کنارے
کرنوں نے کیا جڑے ہیں آبِ رواں پہ تارے

کیا خاک زندگی ہے جکڑی مصیبتوں میں
فرصت نہیں کہ ٹھہریں کچھ آنکھ بھر کے دیکھیں

شمیم

فرصت

اگر فکرِ معیشت سے نہ ہو دم بھر کو بھی فرصت
تو ایسی زندگانی میں کہاں گنجائشِ راحت

نہ ہو فرصت کبھی بیٹھیں گھنے جنگل کے سایوں میں
جہاں چرتی ہیں دن بھر گائیں بھینس بکریاں بھیڑیں

نہ ہو فرصت کہ اک جنگل کا رہرو بھید یہ پائے
کہ ننھے پھل گلہری گھاس میں رکھ کر کہاں جائے

نہ ہو فرصت کہ دیکھیں دن کو ان چشموں کے نظارے
شعاعیں منعکس جن میں ہیں جیسے رات کو تارے

نہ ہو فرصت نگاہِ حسن کی دیکھے کوئی شوخی، یا
ہے رقصِ جانفزا میں جس کے مستی خلد کی مے کی

نہ ہو فرصت کہ دیکھیں وہ تبسم ہونٹ پر آتا
کیا جو چشم سے گون صنم نے بارہا پیدا

عجب کیا ہے جو ایسی زندگانی غم سراپا ہو
سرورِ زندگانی کا ذکر ایسے میں بھلا کیا ہو

محمد سیف الدین شباب

حسین ساگر

ہے چشمۂ محبت تو اے حسین ساگر — دلچسپ و جاں فزا ہے کیا خوب تیرا منظر
کرتے ہیں سب نچھاور دُرِ نیاز تجھ پر — دوشیزۂ سحر بھی کرتی ہے ناز تجھ پر
دکھلا رہی ہے کیا کیا، وہ دل ربا ادائیں — گرویدہ کر رہی ہیں سب کو تری فضائیں
بن کر تری محبت خود چھا رہے ہیں بادل — نظارہ کر رہے ہیں منڈلا رہے ہیں بادل
بجلی کی طرح ہر دم بیتاب ہو رہے ہیں — صہبائے دید رُخ سے سیراب ہو رہے ہیں
تو چشمۂ طرب ہے تجھ پر خدا کی رحمت — ہر سُو تری بدولت، چھائی ہے شامِ عشرت
آ آ کے دیکھتا ہے ہر ایک تیرا منظر — لیکن کھُلا نہ تیرا، رازِ نہاں کسی پر
ہے دلفریب منظر، تیری روپہلی چادر — ہے دامنِ فسوں گر، تیری روپہلی چادر
چشمِ تمیز گر ہو، سب خوبیاں عیاں ہیں — الفت کی تجھ میں ظالم نے رنگینیاں عیاں ہیں
شانِ نہفتہ تیری، پوچھے کوئی صبا سے — رازِ آشنا کا اکثر، کھلتا ہے آشنا سے
عالم میں چار سو ہے الفت کا تیری شہرہ — بیٹھی سروں میں موجیں گاتی ہیں راگ تیرا
وارفتہ ہو نہ کیوں کر، دل سے شباب تیرا — دم بھر رہے ہیں ظالم، ہر سو حباب تیرا
ہمراز ہے تو میرا، چاہوں نہ تجھ کو کیوں کر — قائم مری طرح ہے تو ایک بے وفا پر

میری نظر میں گویا تو حور ہے پری ہے
تصویر جان و دل کی تو جیتی جاگتی ہے

مخزن۔ اپریل

محسن زیدی

غلام کا خواب

بکھرے دھانوں کے قریں لیٹا تھا افریقی غلام
ہاتھ میں ہنسیا کو تھامے سو گیا ہو کر نڈھال
سینہ اس کا تھا برہنہ اور کپڑے تار تار
ریت میں سب اٹ گئے تھے اس کے گھنگھریالے بال
کچھ تھکن، درماندگی، دھند اور سایہ نیند کا
خواب کی رعنائیاں اور دیس کا اپنے خیال

کالی آنکھوں والی ملکہ اس نے دیکھی خواب میں
بیچ میں بچوں کے تھی وہ صاحبِ جاہ و جمال
اور وہ بچے اس کو خود تھامے تھے کتنے پیار سے
ڈالے تھے گردن میں باہیں چومتے تھے اس کے گال
دیکھ کر یہ اشک اک آنکھوں سے ٹپکا ریت پر
جس نے افشاں کر دیا مجبوریٔ حسرت کا حال

اس نے پھر دیکھا کہ جیسے برق رفتاری کے ساتھ
ساحلِ نا تجربا پر وہ چلا اڑتا ہوا
بن گئیں تھیں سونے کی زنجیریں گھوڑے کی لگام
جھنجھناہٹ جیسے ہو باجہ کوئی بجتا ہوا۔
ہر قدم پر اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب
خاتمہ تلوار کے جھٹکوں سے گھوڑے کا ہوا

دشت و در صحرا بیاباں سب زبانِ حال سے
کہہ رہے تھے ملک کی آزادی کا اس سے پیام
بے تکلف، وحشیانہ سی ہوائے دشت نے
دی مبارک باد اس کو اور کیا جھک کر سلام
روح نے انگڑائی لی وہ رہ گیا سوتا ہوا
پُرمسرت خواب اس کا بن گیا خوابِ دوام
کوڑے برسائے گئے اس کو جگانے کے لئے
دھوپ کی شدت نے بھی بڑھ کر جلایا جسم کو
پر اسے تو موت کی تھی نیند یوں آئی ہوئی
ظلم کا احساس ہوتا ہی نہیں تھا جسم کو
روح تھی آزاد جس نے کر دیا آزاد اُسے
توڑی زنجیر غلامی اور چھوڑا جسم کو

قیصر

موت سب کو یکساں کر دیتی ہے

فخر ہے جن پر ہمیں وہ خاندانی عزتیں — نام کو جن میں نہیں ہے اصلیت، جو ہیں سراب
سامنے تقدیر کے تدبیر چل سکتی نہیں — موت آ کر سب کو کر دیتی ہے اکدم محوِ خواب

جب وہ اپنے بیوفا ہاتھوں کو کرتی ہے دراز — تختِ شاہی ٹوٹتے ہیں، سرنگوں ہوتے ہیں تاج
اک درانتی اور کھرپے کے برابر ہو گئے — خاک میں جب مل گئے وہ جن کا دنیا میں ہے راج

جیت سکتے ہیں جو میداں زور سے تلوار کے — اور کر سکتے ہیں اس میں تازے پودے وہ نصب
جو دلیلِ فتح یابی ہیں، جو وجہِ ناز ہیں — لیکن ان پر بھی گرے گی ایک دن برقِ غضب

ایک دن کمزور ہو جائیں گے وہ مضبوط جسم — موت کے پنجے میں پھنس جائیں گے آخر کار جب
قیدیوں کی طرح آئیں گے نظر دم توڑتے — دفن ہو جائیں گے آخر قبر میں وہ سب کے سب

عمر بھر کی کوششوں سے جو ملی ہیں نیکیاں
وہ تمھارے سامنے ہی ہو رہی ہیں سب فنا
تو تم اپنے کارناموں پر ہو کیوں اترا رہے
یہ سمجھ لو خوب، ان کو چار دن کی ہے بقا

موت کی اک روز خوں آلود قرباں گاہ پر
دیکھو مفتوح کی طرح ہو جائیں گے فاتح ہلاک
اپنے اپنے مقبروں میں دفن ہو جاؤ گے تم
پا سکیں گے تم کو کیا، گو عمر بھر چھانیں گے خاک

کارنامے صرف نیکوں کے رہیں گے دہر میں
بعد ان کے، پھول بن کر دیں گے خوشبو برملا
انکی خوشبو کی لپٹ سے آنے والوں کا دماغ
بارِ احسانِ شمیمِ جاں فزا ہو جائے گا

نظم طبا طبائی

نوعِ بشر سے محبت

ابو ابن ادھم پہ رحمت خدا کی
ہوا خوابِ شیریں سے بیدار اک شب
وہ کیا دیکھتا ہے کہ نورِ قمر سے
درخشاں ہیں کمرے میں دیوار و در سب
وہاں رونق افروز ہے اک فرشتہ
کتابِ طلائی میں کچھ لکھ رہا ہے
ابو نے نہایت دلیری سے پوچھا
بتا اے فرشتے! یہ تحریر کیا ہے
اٹھایا فرشتے نے سر اپنا فوراً
نظر کی ابو پر بصد مہربانی
بتایا کہ یہ نام ان اشخاص کے ہیں
جنہیں حق سے ہے اُلفتِ غیر فانی
ابو نے کہا کیا مرا نام بھی ہے
ہلایا فرشتے نے انکار کا سر

یہ معلوم کر کے وہ آہستہ بولے
مگر اس کا دل مطمئن تھا سراسر
مجھے کم سے کم ایسے لوگوں میں لکھ دے
جو کرتے ہیں نوعِ بشر سے محبّت
فرشتے نے یہ بات منظور کر لی
لکھا نام اس کا ہوا واں سے رخصت
مگر دوسری رات پھر وہ فرشتہ
بہت شادماں ہو کے کمرے میں آیا
ابو ابن ادھم معاً جاگ اٹھا
کچھ اس قسم کی روشنی ساتھ لایا
دکھائے اُن اشخاص کے نام اس نے
جنھیں عشقِ حق نے مشرّف کیا تھا
ابو ابن ادھم مگر سب سے پہلے
کتابِ طلائی میں لکھا ہوا تھا

محمد حسین آزاد

اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھُلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

آ دیکھو لے اپنے نشاں ننگ و نام نے
باندھی کمر ہے کس کے، ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے سامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنوان چلے چلو

آئینۂ دل کا گردِ سفر سے اجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تابِ قرار ہے
کرنا ہے جب کہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

رکھّو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم
اور رہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزّت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دوزخ کو آب فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے
آبِ رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
جو تھم رہے یہاں وہی خرد دل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتح یاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
اب خاتموں پہ آگئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبلِ فتح کہ میداں لے لئے
ہے کرنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

حالی

دوست

وہ دل رُبا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دُور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اس کا طلسم سارا

جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تُو نے اس کو
تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرام دل سمجھتا

چل دیں گے جب وہ سارے ان بلبلوں کی مانند
بعد از بہار جو رُخ کرتی نہیں چمن کا

جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آ کے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا

بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غمگیں
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آ کے لے گا

جس طرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جا کر
پھر موسمِ خزاں میں آ کر رہے ہم سے ملتا

رسا ہمدانی

تتلی

آدھے گھنٹے تک تجھے میں غور سے دیکھا کیا
جم کے بیٹھی زرد گل پر ننھی تتلی واہ وا
کیا خبر تو خواب میں ہے یا کہ محوِ نوش ہے
کچھ نہیں جنبش ہے تجھ میں ایسی تو خاموش ہے
منجمد دریا کی صورت کچھ نہیں جنبش تجھے
خوش ہو تو ہیں منتظر جھونکے ہوائے صبح کے
جب درختوں میں ہوا جا جا کے پاتی ہے تجھے
وہ بلاتی ہے باہر بلاتی ہے تجھے
یہ زمیں مری ہے جس پر ایسا اچھا باغ ہے
یہ شجر مرے ہیں مری بہن کا یہ باغ ہے
رہ گئے ہیں تیرے پر تو تھک گئی آرام سے
ہے جگہ محفوظ یہ ہوگی یہاں راحت تجھے
منتظر ہیں۔ آ ہمارے پاس بے خوف و خطر
بیٹھ جا نزدیک ہم لوگوں کے تو اک شاخ پر
موسمِ گل کا فسانہ ہم سنائیں گے تجھے
پھر گزشتہ نوجوانی ہم دکھائیں گے تجھے

پیارے بچپن کا زمانہ ہائے نافہمی کا سن
ایک دن اس کا تھا گویا آج کل کے بیس دن

ساقی۔ ستمبر ۱۹۳۰ء

حفیظ جالندھری

کاہل کا گیت

اب شام ہو چلی ہے اب چھا چلا اندھیرا
دنیا پہ آسماں نے صبر و سکوں بکھیرا
اور دامنِ شفق پر
سُرخی نے رنگ پھیرا
مستور ہیں ہوا میں اس پر سکوں فضا میں
کچھ میٹھے میٹھے نغمے
کچھ گیت کچھ ترانے
لیکن اداس ہوں میں بالکل اداس ہوں میں

بے کار ہی گذارا یہ دن بھر آج میں نے
سوچا نہ کاہلی کا کوئی علاج میں نے
اٹھ کر نہیں سنوارا
کچھ کام کاج میں نے

کھیتوں پہ جانے والے   ہمّت دکھانے والے
لوٹے ہیں کام کر کے
دامن خوشی سے بھر کے
خوشیاں منا رہے ہیں   اور گیت گا رہے ہیں

خوش ہو کے اس طرح سے   گاتی نہیں کبھی ہیں
اس خوشنما خوشی کو   پاتی نہیں کبھی ہیں
اس کیف و سرخوشی میں
آتی نہیں کبھی میں
میری اداس گھڑیاں   رہتی ہیں سینہ کوباں
سُن سُن کے یہ منادی
اب ہو چکی ہوں عادی
چپ چاپ سُن رہی ہوں   اور سر کو دُھن رہی ہوں

مغرب کے سُرخ بادل   مرجھا چکے ہیں سارے
اور شام کی جبیں پر   چھٹکے ہوئے ہیں تارے
لیکن میں سرنگوں ہوں
بیٹھی ہوں اک کنارے
بےتاب ہو رہی ہوں   چُپ چاپ رو رہی ہوں
بےکار زندگی پر
بیمار زندگی پر

سر کو کھپا رہی ہوں   آنسو بہا رہی ہوں

لیکن ہے مدّتوں سے   ایسا ہی حال میرا
سب بھول جاؤں گی ہیں   آئے گا جب سویرا
پھر کاہلی کا آکر
دل میں جمے گا ڈیرا
دن بیت جائے گا پھر   یہ وقت آئے گا پھر
خوش ہوں گے کام والے
اور میں کروں گی نالے
تدبیر سے ڈروں گی   تقدیر پر مروں گی

جب صبح کی ضیا میں   ملتی نہیں مسرت
پھر شام کی ردا میں   حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت
دل کو ذرا سنبھالوں   پھولوں پہ آنکھ ڈالوں
دل ہے مرا فسردہ
شاید ہوں وہ بھی مردہ
شاید وہ میرے پیارے   مرجھا چکے ہوں سارے

یہ دن یہ میری راتیں   یہ ماہ و سال میرے

بڑھتے رہے ہمیشہ رنج و ملال میرے
ہاں خوش نما بہت ہیں
خواب وخیال میرے
لیکن انھیں اگر میں تحفے کے طور پر میں
اُس در پہ لے کے جاؤں
دربار میں دکھاؤں
تو دوجہاں کا آقا مجھ کو نکال دے گا

آقا کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گی میں
خواب وخیال کیوں کر جاکر دکھاؤں گی میں
شرمندہ ہو کے یونہی
بس لوٹ آؤں گی میں
غفلت شعار ہوں میں تقصیر وار ہوں میں
اُس نے اگر یہ پوچھا
دُنیا سے لائی ہے کیا
پھر کیا جواب دوں گی اللہ میں کیا کہوں گی

راحت پسند ہستی کچھ کام کاج کر لے
ان محنتوں کا خو گر اپنا مزاج کر لے
جو کام کل کرے گی
وہ اُٹھ کے آج کر لے

اُٹھ کارگہ میں چل کر　　محنت کی راہ میں چل

اُٹھ وقت جا رہا ہے

تُجھ کو بتا رہا ہے

تو عمر کھو رہی ہے　　برباد ہو رہی ہے

محمد سیف الدین شباب

نغمۂ محبت

اے جانِ زندگانی اے نغمۂ محبت — آسائشِ جہاں ہے حاصل تری بدولت
گو ہے جہانِ فانی خوف و ہراس کی جا — کہتے ہیں اس کو عاقل اُمید و یاس کی جا
جو کور دل ہیں چشمِ عزت سے دیکھتے ہیں — انجام و عاقبت میں نفرت سے دیکھتے ہیں
تیار ہونے والی ہر کشتِ زندگانی — وہ تیری منتظر ہے دنیا میں عہدِ فانی
ہے آرزوئے دنیا، ہر آرزو سے پیدا — قسمت کی بے قراری، جوشِ نمو سے پیدا
لیکن میں شادماں ہوں پیدا ہوا تھا جس دم — دیتے تھے لہلہاتی کھیتی کو آبِ پیہم
تیری سُنہری کرنیں، دل ان کا مل رہی ہیں — اور نُور کی شعاعیں، ان سے نکل رہی ہیں
پروائے عز و جاہِ دنیا نہیں ہے مجھ کو — سودائے عز و جاہِ دنیا نہیں ہے مجھ کو
بھرتے ہیں زخم پنہاں مرے دل و جگر کے — خوش کرتے ہیں پرندے مجھ کو روپہلے پر کے
یعنی کبوترانِ خوش رنگ و باد پیما — شاخوں میں جھٹ پٹے میں لیتے ہیں جو بسیرا
پرواز ان کی مجھ کو مسرور کر رہی ہے — تصویر جاہ و عزت دل سے اتر رہی ہے
دلچسپیوں میں ایسا مصروف ہو رہا ہوں — اپنی خودی کو گویا، اے جان کھو رہا ہوں
اس عالمِ شفق میں تیرا خیال آکر — لیتا ہے دل میں چٹکی، ہر لحظہ مسکرا کر

دل بلاغ باغ ہے اور خورسند ہے مزاجی
چھلکے گی میرے دل تک، دنیا کی کیا اداسی

حرفِ لحد نہ مجھ کو، شامِ الم کا دھڑکا
حیراں کریں رموزِ اوقافِ خامشی کیا

انجام بیں ہوں مجھ کو، خوفِ زیاں عبث ہے
افسردہ کرنے والی تحریک یاں عبث ہے

صہبائے عشق تو ہے بیخود ترا ہے ہر دل
سرشار تجھ سے مستی، ہستی میں تو ہے شامل

یا زندہ بے خودی کی، بہتر شراب تو ہے
جانِ شباب تو ہے اور آفتاب تو ہے

بے شبہ جانِ تازہ رُوحِ رواں کی تو ہے
تو جس جگہ نہیں ہے وہ اک مقام ہو ہے

مخزن۔ مئی ۱۹۱۱ء

عظمت اللہ خاں

ننھّا غاصب

مرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ
کھلا ہے محبّت کا تازہ کنول
درخشندہ جیسے سرِ شام زہرہ
اُفق پر سمندر کے آئے نکل
وہ ہاتھوں پہ اپنے کھلاتی ہے اُس کو
وہ پیروں پہ اپنے جھُلاتی ہے اُس کو
وہ رکھتی ہے آنکھوں میں پتلی بنا کے
وہ سوتے میں روتا جو اٹھ بیٹھتا ہے
تو بوسوں سے موتی سے آنسو وہ پونچھے
وہ سو جان سے ہر ادا پر فدا ہے
وہ ہے لال دونوں جہاں جس پہ صدقے
یہ ننھّی سی جاں اور غاصب کے دعویٰ
مرا تختِ زریں ہے تیرے حوالے
ترے دست و بازو فرشتوں کے دستے
تو ہے وہ زبردست جیتے پہ جیتے

طالب بنارسی

نورالٰہی

سلطانِ شرق جس دم تختِ فلک پہ آیا
جب فوجِ اختری کو خورشید نے بھگایا
لیلائے شب نے ڈنکا جب کوچ کا بجایا
جب حکم مہر دمہ نے عزل ونصب کا پایا

لایا ہر ایک ذرّہ ظاہر ظہور تیرا
خورشید بن کے چمکا جو تھا وہ نور تیرا

جب رات کا اندھیرا عالم پہ آکے چھایا
خورشید نے افق میں جب بسترا لگایا
قندیلِ ماہ لے کر، زنگیٔ شب جو آیا
جب فرش چاند تارے کا چرخ نے بچھایا

انجم دکھا رہے تھے ظاہر ظہور تیرا
ہر نجم کی ضیا میں ظاہر تھا نُور تیرا

جب باغ میں گیا گلگشت کے بہانے
نکلے شجر کے پتّے تیرا پتہ بتانے!
سوتے تھے جتنے سبزے چادر فلک کی تانے
جاگ اٹھے اک سرے سے سب نامِ حق جگانے

گاتے تھے گلستاں میں، نغمہ طیور تیرا
جس گل کا چہرہ دیکھا اس پر تھا نور تیرا

یوں شوق مجھ کو لایا لہرا کے سوئے دریا　　پیاسے کو جس طرح سے ہو جستجوئے دریا
تھا غرق بحرِ حیرت میں ڈوبدوئے دریا　　جن گوہروں سے افزوں تھی آبروئے دریا

ان میں بھی غائبانہ دیکھا حضور تیرا
دُرِّ خوش آب میں بھی ظاہر تھا نور تیرا

بالائے کوہ میں جب مانندِ کاہ آیا　　سنگ و شرار دونوں کو ایک ساتھ پایا
باندھے کمر کھڑا تھا کوہِ گراں خدایا　　تمجید کا مصلّا صحرا کو تھا بنایا

جلوہ دکھا رہا تھا جو کوہِ طور تیرا
اس پر بھی بہرِ موسیٰ چمکا تھا نور تیرا

جب چھوڑ کر کلیسا سوئے کنشت آیا　　حسنِ ازل کا عالم روئے صنم میں پایا
گویا خدا نے اپنے ہاتھوں اسے بنایا　　اس کی جھلک سے جھک کر میں یہ زباں پہ لایا

رحمان گنج، تیرا ہے رام نور تیرا
دیر و حرم میں یکساں پھیلا ہے نور تیرا

جب دشتِ پرخطر میں مانندِ قیس بھٹکا　　آنکھوں میں ہر بگولہ کانٹے کی طرح کھٹکا
خودرو گلوں نے بھی واں دامن نہ مجھ سے جھٹکا　　نکلی صدائے اشہد غنچہ جو کوئی چٹکا

جیتا تھا ہر درندہ، نامِ طہور تیرا
نورِ شہاب میں تھا رخشندہ نور تیرا

صحرا میں بھی خضر نے پایا نشان تیرا　　کشتی پہ وجد کرتا تھا بادبان تیرا
اور رنگِ حسن قدرت تھا آسمان تیرا　　جلوے دکھا رہا تھا سارا جہان تیرا

پھیلا جلال پایا، نزدیک و دور تیرا
اندھا تھا خود وہ جس کو سوجھا نہ نور تیرا

تو رنگ بن کے ظاہر یا بو بنا چھپا تھا   تیری چمک نہیں تھی تو پھر گلوں میں کیا تھا
دیر جہاں میں دیکھا جس مہ جبیں کا ماتھا   اس کی جھلک میں بے شک پر تو ترا پڑا تھا
اس جسم زار میں بھی کچھ تھا وہ نُور تیرا
کہتے تھے نُور جس کو ہم تھا وہ نُور تیرا

جس شمع انجمن میں ہمدم جلا کے لائے   پروانے لو لگائے جانسوز بن کے آئے
پروانہ جان کی تھی دم بھر نہ جینے پائے   کیا شے تھی شمع جس کو رکھنی تھی سر چڑھائے
روشن تھا اس میں جلوہ رب غفور تیرا
تھا شمع کی جلا میں رخشندہ نُور تیرا

جب کان میں گئے ہم اک لطف آرہا تھا   دیکھا کہ اختروں کو ہیرا چھکا رہا تھا
نیلم سے چرخ نیلی چکرایا جا رہا تھا   ہر لعل لالہ رویوں کو خوں رلا رہا تھا
تھا ان جواہروں میں حسنِ وفور تیرا
جسم بلور میں بھی لامع تھا نُور تیرا

ہے خاکدان خالی، ہے آسمان خالی   گر تو نہیں تو ہیں سب کون و مکاں خالی
تجھ سے نہیں خدایا کوئی جہان خالی   کافی ہے رمزداں کو تیرا نشان خالی
قائل تھا زندگی بھر جس طرح نُور تیرا
طالب بھی دیکھتا ہے ہر شے میں نُور تیرا

مخزن۔ نومبر ۱۹۰۶ء

اثر لکھنوی

کسان

جھٹپٹا وقت ہے چھائی ہوئی خاموشی ہے
ایک شخص اور اُسے گھیرے ہوئے چار طرف
کچھ زمیں توڑی ہوئی، کچھ دلِ بے رحم سی سخت

اُس کے نزدیک ہیں دو گھوڑے وہیں اک ہل بھی
تو بہائم کو سدھاتا ہے بناتا ہے ہل
اور کھیتی کے لئے کرتا ہے طیار زمیں

کچھ سُنا فاصلہ قرنوں کا ہے حائل ہم میں
کیا دعا مانگتا ہے شام کی تنہائی میں
سر جھکائے ہوئے خاموش نظر سوئے زمیں
کیا ہوا جو حماقت سے بھرا تیرا جواب
کم ہوا قیدِ مشقّت سے تری اور اک دن
شب کے بخشندہ خدا کا تجھے لازم ہے سپاس

پھیلتی جاتی ہے اندھیاری جو دھیرے دھیرے
بھیڑا اور رجوتی زمیں ایک ہوتی جاتی ہے
ہے بہائم کے قریب ان کا سدھانے والا
ان سے اونچا ہے سر اس کا فقط دو مُٹھی
ایک ڈو مٹھی فقط، ہاں مگر اتنے ہی بس
دفن دوزخ کی ہیں گہرائیاں پستی ہیں ادھر
تو ادھر رخصتِ فردوس سے ہیں دوش بدوش
بلکہ دیوتاؤں کے ایوان سنگھاسن لیواں
اور پاسنگ ہیں رتھ، دبدبہ، ازتارلباس

۱۹۴۲ء

عظمت اللہ خاں

ہم سات ہیں

(۱)

بھلا ننھّی سی جاں معصوم ناداں
کہ جینا ہو جس کے لئے کھیل سا
جسے بوٹی بوٹی میں محسوس ہو جاں
اُسے کیا خبر موت ہے کیا بلا

(۲)

ملی ایک لڑکی مجھے گاؤں والی
ابھی دانت ٹوٹے ہی تھے دودھ کے
وہ بالوں کے گھونگر نہیں جن کی گنتی
وہ گچھّے کے گچھّے لٹکتے ہوئے

(۳)

رہی گاؤں جنگل کی بوباس ساری
وہ پہناوا اس عجب وضع کا
رسیلی تھیں آنکھیں بہت ہی رسیلی
وہ پیارا سا مُکھڑا کہ جی خوش ہوا

(۴)

بہن بھائی کتنے ہیں بیٹی تمھارے
بتاؤ کہ معلوم ہو ہم کو بھی
بہن بھائی ہم سات ہیں اور کتنے
یہ کہ کر وہ حیرت سے تکنے لگی

(۵)

کہاں ہیں تمھارے بہن اور بھائی
کہا سات ہیں ہم کرو یوں بچار
کہ دو بھائیوں نے ہے دلی بسائی
گئے لام پر دو سمندر کے پار

(۶)

قلندر کے تکیے میں پیڑوں کے نیچے
بہن ایک سوتی ہے بھیّا کے ساتھ
وہیں گھر ہمارا ہے مسجد کے پیچھے
میں پاس اُن کے رہتی ہوں میّا کے ساتھ

(۷)

بناتی ہو تم دو ہیں دلّی میں بستے
گئے لام پر دو سمندر کے پار
بتاؤ تو پھر کس طرح سات ہوں گے
مری بھولی بھالی کرو تو شمار

(۸)

کہ ہم سات ہیں لڑکیاں اور لڑکے
سبھوں کو ہے اس کی خبر گاؤں میں
گو دو بہن بھائی وہ بھی جو سوتے
ہیں تکیے میں پیڑوں تلے چھاؤں میں

(۹)

ترے ہاتھ پیروں میں ہے جان کتنی
قلابازی کھاؤ کہ مارو قلانچ
جو سوتے ہیں قبروں میں کیا ان کی گنتی
بہن بھائی اس طرح تم سب ہو پانچ

(۱۰)

ہری انکی قبریں ہیں مینھ ہیں جو برسے
مہکتی ہے تکیہ میں پھولوں کی باس
کوئی دس قدم پر مری ماں کے گھر سے
بہن بھائی دونوں ہیں بس پاس پاس

(۱۱)

وہیں بیٹھ سیتی ہوں گڑیا کے کپڑے
وہیں گڈّے گڑیا کے کرتی ہوں ریت
وہیں ہنڈکلھیا پکاتی ہوں جا کے
مزے کے انھیں میں سناتی ہوں گیت

(۱۲)

بسیرے سمے جوں ہی سورج ہو ڈوبا
رہے جھٹ پٹے کا سہانا سماں
اٹھا لاتی ہوں اپنے کھانے کی ہنڈیا
میں پاس ان کے کھاتی ہوں کھانا وہاں

(۱۳)

وفا تن کے لکھا تھا پہلے گزرنا
مرض سے بہت دکھ اٹھاتی رہی
تو اللہ میاں نے کیا درد اچھا
یہ دل ہی گیا اُٹھ کہ جاتی رہی

(۱۴)

تو تکیہ میں رکھا درختوں کے نیچے
کہ چلتی ہے گرمی میں ٹھنڈی ہوا

وہیں قبر کے پاس ہم کھیلتے تھے
میں خود اور مقبول بھائی مِرا

(۱۵)

گئیں گرمیاں اور برسات آئی
دھنواں دھار برسا کہ جل تھل بھرے
تو مقبول بھیّا کی پھر آئی باری
برابر سوتا ہے ماں جائی کے

(۱۶)

وہ جنّت کو دونوں سدھارے ہیں بیٹی
وہیں رہنے اب تو وہ دن رات ہیں
تو تم کے ہوئے پھر بتاؤ تو بولی
میاں جی کہا تو کہ ہم سات ہیں

(۱۷)

نہیں ہوتی مُردوں کی زندوں میں گنتی
یہ سب بھولے پن کے خیالات ہیں
عقیدے کی اپنے وہ تھی ایک بچّی
کہا پھر نہیں، واہ، ہم سات ہیں

+ + +

سورج نرائن مہر

خوابِ دُنیا

ہے جہانِ گزراں خواب کا بالکل نقشہ دیدۂ حضرتِ انساں کے لئے دھوکا سا
شادمانی کا تبسم ہے کہ آنسو غم کا یہ بھی جھوٹا ہے جو میری سنو وہ بھی جھوٹا
یاں ہے جو چیز وہ سچی نہیں جز نام خُدا

نام و شہرت کے یہ چمکارے بھی بالکل جھوٹے قتلِ نیرنگِ شفق ہم نے بدلتے دیکھے
عشق و امید ہے کیا حسن سمجھتے ہو کسے یہ ہیں وہ پھول چنے جائیں جو قبروں کے لئے
یاں ہے جو نور وہ قائم نہیں جز ذاتِ خدا

بحر طوفانیٔ دنیا میں ہیں ہم سرگشتہ موجِ غم نہیں ہے جہاز اپنا تھپیڑے کھاتا
روشنی عقل کی ہے وہم کا یا چمکارا اُن سے طوفاں کے سوا ہم نے نہ کچھ بھی دیکھا
یاں ہے جو شے وہ مسکن نہیں جز نام خُدا

اثرؔ لکھنوی

باغی انسان

چہچہے طائروں کے ہل ہل کر　　اور شاخیں ہوا میں ہل ہل کر
نو بنو نغمے پیش کرتے تھے　　نغمے تھے یا شراب کے جرعے

زیرِ گلبن تھا میں نشاط میں غرق　　سارا گلشن تھا انبساط میں غرق
تھی وہ حالت دلِ گداختہ کی　　جب خیالاتِ عشرتِ آگیں بھی
ساتھ لاتے ہیں جذبۂ آلام　　اک خلش ایک لذتِ بے نام

مستحق پا کے محرمی کا مجھے　　اپنی رعنائیوں سے فطرت نے
کر کے وابستہ روح کو میری　　جو حقیقت تھی آئینہ کر دی
سخت نادم ہوا ملول ہوا　　چشمِ باطن سے میں نے جب دیکھا
آدمی ہو گیا ہے کیا سے کیا
آفرینش کا بھول کر منشا

کنج پر مالتی کے پھولوں سے
جال پھیلے ہوئے تھے خوشبو کے
پیارے پیارے وہ چاند سے مکھڑے
بلکہ یہ کہیے چاند کے ٹکڑے
اُن کو چھو لیجیے تو میلے ہوں
نازک اندام ہوں تو ایسے ہوں
میں ہوں شاعر مرا عقیدہ ہے
دل گواہی بھی اس کی دیتا ہے
پھول خوش ہوتے ہیں ہوا کھا کر
کھول دیتے ہیں گود شرما کر

سبزے پر چُگتی پھرتی تھیں چڑیاں
لڑتی اور گتھ کے گرتی تھیں چڑیاں
میل ابھی ہے ابھی لڑائی ہے
اور اسی وقت پھر لڑائی ہے
کھُلے بندوں ہیں پھر ملاقاتیں
پھر وہی چاہ پیار کی باتیں
سادگی میں ڈھٹائیاں ان کی
اف وہ کافر ادائیاں ان کی
دل میں کیا کیا تھے چاؤ کیا معلوم
لیکن اتنا تو کھل گیا مفہوم
ان کی ہر اک خفیف جنبش بھی
میری رگ رگ میں کیف بھرتی تھی

پنکھڑیاں کونپلوں کے ہاتھ میں تھیں
یہ نسیم سحر کی گھات میں تھیں
دیکھے اُن کو فریفتہ ہو جائے
بانہیں گردن میں ڈال کر سو جائے
کوئی کچھ بھی کہے مجھے ہے یقیں
ان کے دل میں یہی امنگیں تھیں
اگر اس قول میں صداقت ہے
اور معصوم و سادہ فطرت ہے
حق بجانب ہے پھر جو ہیں محزوں
ہو کے فریاد بار بار کردل
آدمی ہوگیا ہے کیا سے کیا
آفرینش کا بھول کر منشا

۱۹۴۰ء

عظمت اللہ خاں

یونان کے جزیرے

یونان کے جزیرے، یونان کے جزیرے   سافو کا دل لگانا بلبل کا سا چہکنا
وہ بزم کے سلیقے وہ رزم کے وتیرے   ڈی لاس کا ابھرنا فی بس کا وہ چمکنا
اب بھی بسنت رت ہیں جنّت بنا ہے سب کچھ   سورج کے اک علاوہ ڈوبا ہوا ہے سب کچھ

سی ای وہ اور ٹی ای شعر و سخن کی دیوی   وہ بین سورمائیؔ وہ بانسری پریمی
اپنے ہی ساحلوں پر شہرت نہیں ہے جن کی   جن کے جنم کی بھومی اُن کے لئے ہے گونگی
وہ راگ گونجتے ہیں یورپ میں دور پل کر   ان پاک ٹاپوؤں سے اسلاف کے نکل کر

مرتھان اور پربت ان کا وہی ہے نقشہ   مرتھان کے کنارے لہرا رہا ہے دریا
کھویا ہوا سا تنہائیاں میں نے خواب دیکھا   آزاد پھر یہ اک دن یونان دیس ہوگا
پیوند خاک جس جا ایران کی ہو سینا   خود کو غلام سمجھوں ممکن بھلا یہ کب تھا

ساحل کی وہ پہاڑی وہ شہریار بیٹھا
سلمس بھی سامنے ہے لختِ دلِ سمندر
نیچے جہاز صدہا اقوام کی وہ سینا
بیڑے یہ سب اُسی کے اس کا ہی لاؤ لشکر
گنوایا تھا اس نے ایک اک کون نکلتے
سورج کے ڈوبتے تک وہ ٹھاٹ سب کہاں تھے؟

ہاں ٹھاٹ وہ کہاں ہے تو بھی بتا کہاں ہے
میرے وطن یہ ساحل تیرے جو بے صدا ہیں
وہ گیت سورمائی گویا کہ بے زباں ہے
تیرے نہ دیوتا ہیں وہ اب نہ سورما ہیں
کیا اب یہ دیوتائی یکتا ستار تیرا
ان بے کمال ہاتھوں دنیا میں خوار ہوگا

شہرت کا کال ایسا اتنا ہی ہے غنیمت
مانا کہ قوم میری پہنے ہوئے ہے بیڑی
اک عاشقِ وطن کو آئے ذرا سی غیرت
شاعر کے واسطے یاں اب کیا رہا ہے باقی
اے دیس چاہتا ہے اس سے زیادہ کیا تو
یونانیوں پہ لجا یونان پر دو آنسو

روتے رہیں گے کب تک ماضی کی داستاں کو
ہم شرم سے گڑے ہیں ابا تھے انہیں مرتے
وہ سورما وطن کے بس نام ہیں زباں پر
پرتھی نکال تیرے اسپارٹا کے مردے
ان تین سو کے بدلے ہو جائیں تین زندہ
پھر دیکھ لے زمانہ تھرماپلی کا نقشہ

ٹوٹی نہیں خموشی کیسی یہ چپ لگی ہے
سنتا وہ رفتگاں کی آواز آ رہی ہے
اک دور سے گرجتی ندی چڑھی ہوئی ہے
زندہ دماغ تم میں بتلاؤ اب کوئی ہے
اس گوں کا ایک ہو پھر اپنے ہیں دور دورے
رونا یہی ہے سارا زندہ ہی خود میں ہوں گے

سنتا ہے کون اپنی کچھ چیز اور چھیڑیں
بھر دیجئے لبالب جامِ شرابِ سامی

ترکوں کو ہی مبارک جنگِ جدل کی بیریں
ہو خون تاک سے او ہم اور عیش کامی
سُنکر صدائے عشرت کس شوق سے ہے اُمڈے
کیسے ہیں ٹوٹے پڑتے کس کے مست بندے

رائج ہے ناچ پر رہک اس کا ہے اب بھی چرچا
پر رہک پرے کہاں ہیں ان کا کچھ پتا ہے
اک بزم کا سبق تھا اک رزم کا سبق تھا
مردانہ تر سبق کو تم نے بھلا دیا ہے
بنیادِ علم و فن کی کڈمس کی وہ الف بے
تم سے غلام ہرگز اُس کے نہ اہل ہوتے

بھر دیجئے لبالب جامِ شراب ساقی
ہم نے بھلا دیئے ہیں مضمون وہ بھی آخر
گانے اناکریٰ جن سے ہوتے ہیں نامی
سچ ہے پلی کراٹس آقا تھا ایک جابر
مانا کہ تھی غلامی اُس بات سے مگن تھے
اس وقت اپنے آقا اپنے ہی ہم وطن تھے

جابر وہ کرسنس کا وہ حریت کا حامی
وہ بے جگر بہادر وہ حریت کا شیدا
وہ کون ملٹیاڈس تاریخ میں گرامی
ہو جائے کچھ دنوں کو پھر مستبد جو آیا
شیرازہ ہو اکٹھا مٹ جائے پھوٹ ساری
بکھرے ہوؤں کو باندھے زنجیرِ اتحادی

بھر دیجئے لبالب جامِ شراب ساقی
سیولی کے پربتوں پر پرگا کے بھی کنارے
اب بھی بچی کھچی کچھ ہے ایک نسل باقی
ڈورک نژاد مائیں جنتیں تھیں جیسے جائے
اک آدھ یاں عجب کیا پڑ جائے بیج کوئی
جس کی رگوں میں دوڑے خونِ ہراکلیڈی

کرنا نہ تم بھروسہ ہرگز فرنگیوں پر
فرمانروائے مغرب قوموں کو بیچتا ہے
تلوار پہ ہی دیسی دیسی سپاہیوں پر
اقوام پر بھروسہ ہر حال میں رہا ہے

لاطینیوں کے فتنے عثمانی عساکر یونان توڑ دیں گے تیری سپر کو آخر

بھر دیجئے لبالب جامِ شرابِ سامی ساغے میں ناچتی ہیں وہ پیڑیاں وطن کی
آنکھیں وہ کالی کالی موتی کئی رسیلی کلیاں ہیں کھلنے والی جوبن پہ اس چمن کی
اس دھیان سے ہی آنسو چلتے ہوئے بھرائے آخر غلام ہوں گے ان گودیوں کے جلنے

ہیں اور سونیم کی مرمر کی وہ ڈھلانیں موجوں کے ساتھ میری بے چین روح تڑپے
لہروں کی اور میری آپس میں مل کے تانیں مثلِ سوان گاتے، گاتے ہی جان نکلے
میرا وطن نہیں ہے جس ملک میں غلامی دے مارئے زمیں پر جامِ شرابِ سامی

اثر لکھنوی

خدائے نامعلوم

شام کی وہ دھندلی دھندلی روشنی پھیکی پھیکی میلی میلی بیجنی
اس سے بالا اور بہت بالا عیاں ایک نورانی محیطِ بے کراں
بھاپ اور شعلے کے ایسے کھیلے یا ستارے چھوٹے چھوٹے جھلملے
جیسے پَر پروانۂ سوزاں کے ہوں یا پگھلتے شیشے کے پرکالے ہوں
اور کہساروں پہ رقصاں روشنی اپنے سایہ سے گریزاں روشنی
وہ ستاروں پرستاروں کا ظہور نور پر ہو ضوفگن جس طرح نور

ہم نہ سمجھے روشنی بڑھتی گئی عشرتِ نظارگی بڑھتی گئی
اس قدر محوِ تماشہ تھے، خموش کچھ نہ تھا اپنے سراپا کا بھی ہوش
اور دل سرشار ایسے حسن سے جو نہیں ہے چشمِ ظاہر کے لئے
جس کو آنکھیں دیکھ سکتی ہی نہیں
آستاں کی خاک ہے مہرِ مبیں

۱۹۳۲ء

قیصر

بی بی حوّا آدم سے کہتی ہیں

صبح کی ہے کیسی فرحت بخش اور ٹھنڈی ہوا — اور ہے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہلکی ضیا
چہچہے چڑیوں کے کیسے دل کشی کے ساتھ ہیں — اور شگفتہ پھول کیسی تازگی کے ساتھ ہیں
کس قدر دل چسپ ہے سُورج کا وہ عزمِ سفر — جب نظر آتا ہے اس کا گوشۂ مشرق سے سر
جب زمین پر فضا پر وہ نظر دوڑاتا ہے — اُس کے گوشہ گوشہ میں وہ عکس اپنا پاتا ہے
جب سنہری کرنیں پھیلیں اور باغوں پر پڑیں — جھاڑیوں، پھولوں، پھلوں پر اور درختوں پر پڑیں
وہ چمک کر رونقِ گلزارِ عالم ہو گئے — موتیوں کی طرح سے قطرات شبنم ہو گئے
سوندھی سوندھی خوشبوئیں کیسی زمیں سے آتی ہیں — ہلکی ہلکی بوندیں پڑ کر جس طرح تھم جاتی ہیں
رات آ کر دے رہی ہے جان و دل کو تازگی — اور پچھلی رات کی چاروں طرف ہے خامشی

بُلبلوں کی نغمہ سنجی۔ چاند کی یہ روشنی
اور ستاروں کی چمک کیسی خوشی بخشی ہے

باعثِ تسکیں نہیں ہے صبح کی ٹھنڈی ہوا — جو کہ پہنچاتی ہے کانوں میں ہر اک دلکش صدا
اور نہ سورج کا وہ نظارہ کہ سطحِ چرخ پر — روشنی میں صبح کی اُس کا نظر آتا ہے سر

اور نہ وہ کرنیں، کہ جب پھولوں پھلوں پر آگئیں
موتیوں کی طرح بوندیں اوس کی چمکا گئیں

اور نہ وہ پانی کی بوندیں، جب زمیں پر آگئیں
سوندھی خوشبوئیں زمیں پر ہر طرف پھیلا گئیں

اور نہ وہ دل کو لبھانے والی شب کی تازگی
جس سے ہے پھیلی ہوئی چاروں طرف اک خامشی

اور نہ بلبل کے ترانے، اور نہ رفتارِ قمر
اور نہ تاروں کی چمک، جس سے ہے فرحت رات بھر

اُن سے کیا ہوگا شگفتہ میرا دل تیرے بغیر
سارے منظر دل پہ ہیں پتھر کی سل تیرے بغیر

عظمت اللہ خاں

چھیل چھبیلی

(۱)

وہ چھوٹی ٹھوڑی کی لہراتی ناگن
وہ ہرنی کی آنکھیں سیاہ اور بڑی
رسیلی چمک ان میں وہ شبنمی
وہ بچپن کی سی تازگی چھایا جوبن

(۲)

تم اس ڈھب کی کب ہو کہ رے رام پیاری
کوئی تم کو باہوں میں لے کر کمر
گلے سے لگائے تمھیں بھینچ کر
بنو تا کہ گھر کی دل آرام پیاری

(۳)

کہیں اک اشارے پہ تم مہرباں ہو
مزے دار تقریر بھائی کہیں
چمک دار شمشیر بھائی کہیں
غرض ڈھل گئیں جیسا موقع جہاں ہو

(۴)

سمجھتے ہیں ہم ہو گئیں اب ہماری
تم اپنی جوانی کے جوبن سمیت
لبِ لعل اور چشمِ پر فن سمیت
وہ ساتھ ان کے چہرہ بھی پھولوں کی کیاری

(۵)

ہماری ہوئیں تم تو ارماں نکالیں
ہو نغمہ سرائی غزل خوانیاں
کریں منتیں ناز برداریاں
چھپائیں تعلق کہ شیخی بگھاریں

(٦)

رہا چاہنا یہ نہیں تیرے بس کا
کریں دین و دولت بھی قربان ہم
تری جان ہیں کہ دیں جان ہم
نہیں تیری فطرت میں اُلفت کا چسکا

(٧)

مگن نیند میں ہے وہ سندر سی صورت
تماشائے حسنِ دل آرام ہے
یہی فرض اس کا یہی کام ہے
یہیں اس کا دوزخ یہیں اس کی جنّت

(٨)

وہ ہے مستِ خواب اور بیدار ہوں میں
تعجب نہیں ہوں جو محوِ خیال
کہ سوچو تعلق کا اپنے مآل
کسوٹی پہ اس کے عمل کو کسوں

(٩)

سرے سے ہو اُلفت فسانہ جہاں پر
پسندیدگی ہے غنیمت وہاں
زمیں سے نہیں ٹھیک بیزاریاں
نہ پہنچیں اگر عشق کے آسماں پر

(١٠)

محبت کو حاجت نہیں کچھ بھی زر کی
محبت کو کافی ہے دل کا لگاؤ
نہیں خوب شاہ مگس کو ہٹاؤ
فقط اس لئے شہد دیتی ہے مکھی

(١١)

بس اس طرح چاہت رہے سیدھی سادھی
محبت کا آیا قدم درمیاں
گئیں عیش رانی کی بے فکریاں
کہاں مسکراہٹ کلی سی چٹکتی

(١٢)

بہت کچھ کمی اس میں مانا عیاں ہے
کرو اس کی اصلاح حسبِ مراد
وگرنہ کہو پھر اُسے خیر باد
کہ بے عیب دنیا میں ممکن کہاں ہے

(١٣)

یہ ہے رنگ میں اپنے اوتار شاید
تو پھر بے وفائی سے کیا روٹھنا
کہ فطری ہے پکا پرایا بھلا
دل اس کا بھی ہو جس سے بیزار شاید

(١٤)

جھلس دیجئے یاں اس کا جاں سوز چہرہ
رگڑ دیجئے یوں کہ بس خاک ہو

شراروں سے اس کے جہاں پاک ہو
رہے ہی نہیں آگ لگنے کا خطرہ

(۱۵)

نہ ہو یہ تو بوسوں پہ پھر جان دیجئے
جوانی دوانی مگر ہوتی ہے
مریض آدمی کی نظر ہوتی ہے
بہت ٹھیک جوبن پہ جب اس کے لوٹے

(۱۶)

دکھاتا ہے صنّاع جب سادہ کاری
تو لیتا ہے وہ ایک سانچے کا پھول
کترتا ہے پھر اس پہ سونے کا پھول
بدلتا ہے نگ جڑ کے ہیئت کذائی

(۱۷)

گلابی سے یاقوت کا گل کا کاسہ
ہر اک پنکھڑی وہ جواہر نگار
وہ نقل اصلیّت کی، پر انجام کار
جتن سے رکھے بند کنجوس راجہ

(۱۸)

تو پھر پھول کی کس طرح قدر کیجئے۔؟
مناسب یہی ہے رہو دور ہی
جو چننے پہ اس کے ہو مجبور ہی
تو پھر سونگھئے چومئے پھینک دیجئے

اثر لکھنوی

تھار

میں خدا جنگ کا تھار مرا نام ہے — کہتے ہیں جس کو فتنہ وہ مرا پیغام ہے
شرق سے ہے غرب تک سب یہ حکومت مری — جنگ مرا مشغلہ صبح سے تا شام ہے
دھاک وہ میری بندھی قومیں ہیں تابع مری — لُطف مرا خاص ہے قہر مرا عام ہے
دہر میں کوئی نہیں مرا حریفِ نبرد — آب مرے خوف سے زہرۂ ضرغام ہے

گرز مرا "جولنر" دیو کا سر توڑ دے
گاؤ زمیں ضرب سے جس کی جگہ چھوڑ دے

پنجۂ فولاد سے گرزِ گراں تھام کر — پھینکتا ہوں دور میں دے کے تکان گرد سر
یہ ہے کمر پیچ وہ جس سے ہو طاقت دوچند — یہ ہے وہ چار آئینہ جس پہ نہ ٹھہر سکے نظر
جس کے علم ہوتے ہی آگ برسنے لگے — تیغ وہ خاراشگاف رکھتا ہوں زیب کمر
کوندا لپکتا نہیں چرخ پہ یہ بار بار — جمع ہوئے ہیں وہاں اُس کے ہی اُڑ کر شرر

دوشِ ہوا پر جنھیں ملکۂ شب لے گئی
تاکہ نہ ایمن رہے میرے غضب سے کوئی

رعد، مرا بھائی ہے آنکھیں مری بجلیاں   قہر سے ڈپٹا جدھر اٹھنے لگا بس دھواں
کھنچتے ہیں جب ابر میں پہیے مری بگّی کے   ہوتی ہے پیدا گرج، کانپتے ہیں آسماں
میں جو رجز خواں ہوا زلزلے آنے لگے   کوہ و زمیں شق ہوئے پھٹ پڑے اونچے مکاں

کون جگہ ہے جہاں تہلکہ برپا نہیں
حشر کا سا ہے سماں کوئی کسی کا نہیں

اب بھی جہاں میں ہے دور زور کا اور تیغ کا   ہوگا وہ آئندہ بھی جیسا سلف میں ہوا
علم جسے کہتے ہیں ضعف کی ہے وہ دلیل   دیکھ لو ہر عہد میں غلبۂ طاقت رہا
علم و ہنر ہیچ ہیں جب نہیں بازو قوی   کوڑیوں کے مول بھی کوئی نہیں پوچھتا

شور زمانے میں ہے تیغِ شرربار کا
حلقہ بگوش اک جہاں آج بھی ہے تمھارا کا

قیصر

انسان کی فصلیں

جسطرح سال بھر میں ہوتی ہیں چار فصلیں انسان کی بھی فصلیں ٹھیک ایسے ہی جہاں میں
موسم بہار کا ہے جس وقت اس پہ آتا جذباتِ عیش کی ہے تصویر جو کہ لاتا
اس وقت کا تخیّل، کیا کیا ہے رنگ لاتا اُس کی بہار کو ہے دم میں خزاں بناتا
گرمی کی فصل جب کہ لاتی ہے ناز و نعمت دیتی ہے اس کو لاکر جس وقت عیش و عشرت
بدمستیوں کا پیالہ، موسم ہے جس کو بھرتا کس شوق سے ہے اس کو انساں پسند کرتا
ممکن ہے وہ خدا تک پہنچے خوشی میں اُڑ کر لیکن یہ حرصِ دنیا کرتی ہے اس کو بے پر
ہوتی ہے رُوح اُس کی پابند کچھ خزاں میں بیکار بن کے قانع رہتی ہے وہ جہاں میں
جو اچھی خوب صورت چیزیں گزر رہی ہیں صناعیوں کو اپنی ظاہر وہ کر رہی ہیں
آتی ہیں جو نظر میں اس کو نہیں ہے پروا ان کی طرف توجہ اس کو نہیں ہے اصلا
ہر شے ہے یوں گزرتی، نظروں کے سامنے سے نالا ہے بہتا رہتا، جس طرح پاس گھر کے
جاڑے کی فصل جس وقت اس پر ہے ننگ لاتی ہوتی ڈراؤنی ہے صورت بہت ہی اُس کی
بدرنگ اور میلا، اُس کو ہے وہ بناتی اور بعض وقت اس کی نوبت نہیں ہے آتی

کیوں اپنی عادتوں سے، جو ہیں فنا کے میلے
ہو جاتا ہے فنا بے آنے سے اُس کے پہلے

عزیز لکھنوی

مئی کا جوان چاند

جوان چاند وہ چمکا مئی کا اے پیاری
بساطِ خواب سے اُٹھ، ہے یہ وقت بیداری

فلک کواکب و مہتاب سے ہوا روشن
زمیں پہ لیمپ ہیں جگنو کے جابجا روشن

یہ چاندنی کی بہار اور یہ خوش گوار فضا
یہ دلفریب مناظر، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

وہ مورنا کے درختوں کا جھنڈ اے پیاری
گھنے گھنے وہ شجر، ہرطرف وہ گُلکاری

زمانہ نیند کا متوالا، دیکھتا ہے خواب
مگر ہے اوڑھے ہوئے سر سے چادرِ مہتاب

چڑھا ہے ایک روپہلا ورق زمانے پر
برس رہا ہے تجلّی کا ابرِ خوشش منظر

چمک ستاروں کی اپنے دکھا رہا ہے فلک
نظر اٹھا تو ذرا جگمگا رہا ہے فلک

نہیں ہے وقت معین کوئی خوشی کے لئے
خوش اپنے دل کو رکھے جب تلک جہاں میں جئے

اٹھ اب زمانے کا کچھ اور رنگ ہے پیاری
زمانہ دیکھ کے یہ سین دنگ ہے پیاری

ہے طولِ زیست کا بہتر طریقہ یہ سب سے
چرا لیا کریں ہم رات کے بھی کچھ لمحے

یہ جاگتی ہے نہیں سو رہی ہے سب دنیا
سویرے صبح تلک لے گی کروٹ اب دنیا

مگر نہیں ہیں زمانے میں اس کی آنکھیں بند
گھڑی ستاروں کی ہے اور پیرِ دانش مند

وہ دیکھتا ہے نظامِ ثوابت و سیار
کبھی نظر میں ہے اجرام چرخِ کج رفتار

ہے دو دلوں کو فقط ذوقِ لذّتِ دیدار
میں جاگتا ہوں ادھر، اُس طرف ہے وہ بیدار

مرا ستارہ ہے اس کے ستارہ سے روشن
وہ کیا ہے آنکھ تری جو ہے شوخ اور پُرفن

یہ وقتِ خواب نہیں جاگ اے مری پیاری
سہانا وقت ذرا دیکھ لے مری پیاری

نہ دُوربین سے دیکھے کہیں وہ تیری آنکھ
پڑے گی رشک و حسد سے پھر اُس پہ میری آنکھ

وہ دیکھتا ہے ان اجسامِ نور کی پرواز
کرے نہ محو کہیں تیری آنکھ کا اعجاز

مخزن۔ نومبر ۱۹۰۹ء

آصف

نوحہ

جاں بحق تسلیم تم اُٹھتی جوانی میں ہوئیں   کس کا دل لائیں جو رکھیں سینہ پر سنگِ مزار
ہاں مگر شاخِ گلاب و نرگسِ بیمار چشم   لہلہائیں گے گیاہِ قبر پر اب سوگوار
سب سے پہلے فصل میں پھولیں پھلیں گے یہ شجر   اور خود رو سرو جھومے گا صدا مردانہ وار
جانتا تھا کون   دیرِ حیاتِ مستعار

نیل گوں نہرِ رواں کے اس کنارے بار ہا   تیر خوردہ عشق کے آئیں گے باقلبِ حزیں
غرق تیرے دھیان میں اور خوابہائے وصل میں   حسرت و ارماں بھرا پہلو میں دل اندوہگیں!
نامراد آہستہ دھرتا ہے قدم دل میں یہ خوف   پاؤں کی آہٹ سے یہ مدفون نہ جاگ اٹھے کہیں
نیند سے پر موت کے غافل ذرا واقف نہیں

اب تو سیلِ اشک اپنا ظاہرا بیکار ہے   کب اجل سنتی ہے پُرغم داستانِ بیکساں
کیا مگر اس سے کوئی فریاد کرنی بھول جائے   کب اجل سُنتی ہے پُرغم داستانِ بیکساں
ناصحا مجھ کو فراموشی تو سکھلائی مگر   ہے تری خود چشم پُرنم غم ہے چہرہ سے عیاں
قصۂ غم ہو چکا اب آگے قاصر ہے زباں

مخزن۔ جون ۱۹۰۹ء

علی الدّین عجز بدایونی

زندگی

کیوں دردناک لفظوں میں کرتے ہو اب کلام　　انساں کی زندگی کا ہے خواب و خیال نام
جس خفتہ بخت سے نہ ہو تفریق اصل و نقل　　سمجھو تم اس کی رُوح کو مردہ ہے لاکلام

ہے زندگی قدیم گنواؤ نہ اس کو مُفت　　مرنے کو یہ نہ سمجھو کہ ہے اس کا اختتام
تو خاک سے بنا ہے ملے گا تو خاک میں　　تھا جسم کے لئے نہ کہ یہ رُوح کو پیام

منشا ہماری زیست کا یہ ہی فقط نہیں　　رنج و خوشی کے ہو رہیں اور کچھ کریں نہ کام
ہر روز بلکہ شغلوں میں ایسے لگے رہیں　　جن سے ترقیات زیادہ ملیں مدام

کرنا بہت ہے کام مگر وقت ہے قلیل　　دل میں ہمارے گو نہیں خوف و خطر کا نام
تاہم دہل کی طرح دھڑکتے ہیں دم بدم　　اور موت کی خبر ہمیں دیتے ہیں صبح و شام

دنیا کو سمجھو جنگ کا میدان دوستو　　اور اس کے عیش جانو کہ ہیں آرام کا مقام
تنبیہہ چاہو تم نہ بہائم کے طور پر　　مردوں کی طرح شوق سے تم ہو شریک لام

آئندہ وقت پر نہ بھروسہ کرو کبھی   گزرے ہوئے زمانہ پہ بھیجا کرو سلام
لے کر خدا کا نام کرو حوصلہ بلند   موجودہ وقت کام میں لاؤ بصد نظام

بتلا رہے ہیں ہم کو بزرگوں کے واقعات   ہم بھی بنیں زمانہ میں یکتا و شاد کام
اور کام وہ کریں کہ جو مرنے کے بعد بھی   قائم رہے جہان کا جب تک رہے قیام

تا گر کسی عزیز کا دنیا کے بحر میں   ڈوبے جہاز اور نہایت ہو مستہام
یعنی جو آگیا ہو زمانہ کے پھیر میں   یہ واقعات دیکھ کے حاصل کرے مرام

پس ہو کے مستعد رہیں مصروف کار ہم   نقصان و فائدہ کا مقدر سے رکھیں کام
جب تک کہ اس کو پورا نہ کر لیں نہ چھوڑیں ہم   محنت اٹھائیں، صبر کریں، عجز ہم مدام

مخزن ۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء

قیصر

گوشۂ تنہائی

کیا خوش نصیب ہے وہ، جو وطن میں اپنے — رہتا ہے پھول بن کر، رنگیں چمن میں اپنے
محدود جس کی خواہش تھوڑی سی ہے زمیں پر — اُلفت بھری ہوئی ہے جس میں وطن کی یکسر
دیتی ہیں جس کی گائیں، کیا دودھ میٹھا میٹھا — کرتی ہیں جس کی بھیڑیں، پوشاک کیا مہیّا
کیسی سفید رُوئی دیتے ہیں کھیت اس کے — رہتے ہیں دُور اُس سے دُنیا کے سارے جھگڑے
گرمی میں پیڑ جس کے کرتے ہیں سایہ اُس پر — جاڑے میں دے رہے ہیں آرام جان کر
وہ لوگ ہیں مبارک جو یوں گزر ہیں کرتے — بے فکریوں میں اپنے دن کو بسر ہیں کرتے
آرام سے ہیں رہتے حاصل ہے تندرستی — دل میں ہو جس کے پیدا امید اور تسلّی
جو میٹھی نیند سو کر آرام پا رہے ہیں — جن کے مطالعہ میں ہر وقت ہیں کتابیں
تفریح کا ہے ساماں موجود پاس جن کے — دیتے نہیں ہیں دھوکا ہرگز لباس جن کے

جو اپنی بے گناہی اور اپنی عادتوں سے
رکھتے ہیں سب کو راضی اور سب کو خوش ہیں رکھتے

پس اس طرح بسر ہو یہ زندگی بھی میری — مجھ کو نہ کوئی جانے، مجھ کو نہ دیکھے کوئی

حالت پہ رحم میری، ہرگز نہ کھائے کوئی　　مر جاؤں جب تو مجھ کو، رونے نہ آئے کوئی
دُنیا سے جب الگ ہوں دنیا ہے جب ہوں رخصت　　پھر کیا غرض دکھاؤں لوگوں کو اپنی حالت
پتھّر نصب نہ کوئی میرے مزار پر ہو
جس سے نہ حال میرا معلوم ہو کسی کو

مقصودِ الفت

کیا مرے حسنِ دلآویز پہ تو مرتا ہے   شعلہ روئی پہ مری جان فدا کرتا ہے
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ سے محبّت مت کر   نگہِ عشق رخِ مہرِ جہاں تاب پہ ڈال

حسنِ بے مثل کو جس کے نہ اجل ہے نہ زوال

کم سنی پر مری مائل ہے طبیعت تیری   حسنِ نوخیز سے وابستہ ہے الفت تیری
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ سے محبّت مت کر   تیری الفت کے ہے قائل رخِ زیبائے بہار

جس پہ ہر سال نیا حسن نرالا ہے نکھار

چاہتا ہے مجھے تو کیا، مری حشمت کے لئے   دل ہے بیکل ترا میرے زر و دولت کیلئے
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ سے محبّت مت کر   چاہیئے تجھ کو کرے بحرِ گہر خیز سے پیار

جس کے انمول جواہر کا نہیں کوئی شمار

پیار مجھ سے ہے تجھے کیا مری الفت کے لئے   دل ہے پروانہ ترا شمع محبّت کے لئے
یہ اگر سچ ہے تو کر مجھ سے محبّت پیارے   بہتر از مہر و بہار دل شیدا میرا

بحر میں بھی نہیں ایسا گہرِ مہر و وفا

ممتاز احمدؒ

رحم

رحم ہے اک امر طبعی ہو نہیں سکتا بہ جبر
آسماں یوں اس کو ٹپکاتا ہے باراں جیسے ابر

یہ ہے دوگونہ مبارک یعنی دونوں کیلئے
جو کرے اسکے لئے جس پر کرے اس کے لئے

صاحبِ قوت ہیں یہ پاتا ہے اوجِ برتری
اور سر آرا کو ہے زیبا تر از تاجِ شہی

شوکتِ دنیا پر اسکی ہے دلیل اس کا عصا
اور نشاں ہے سطوت و تمکین ظل اللہ کا

رحم ہے شانِ جہاں بانی سے بالاتر مگر
یہ سریرِ قلبِ سلطاں پر ہے ہوتا جلوہ گر

رحم سے موصوف ہے خود خالق ارض و سما
اس سے بڑھ کر اور کیا دیں اسکی رفعت کا پتا

قوتِ انساں تب ہے قدرتِ یزداں کی نقل
ہو ترحم جب خمیرِ مایۂ دکّان عدل

ہم دعا میں رحم کی کرتے ہیں حق سے التجا
یعنی لازم ہے ہمیں خود رحم کرنا جا بجا

مخزن۔ مئی ۱۹۱۴ء

قیصر

گُلاب کا آخری پھُول گرمی کے موسم میں

آخری پھول یہی موسمِ گُل کا ہے کھِلا — صحنِ گلشن میں یہی ایک رہا ہے تنہا
خوشنما جتنے تھے، مُرجھا گئے اس کے ساتھی — خاک میں مل گئی ہر ایک کی پتّی پتّی
نہ کسی قسم کا ہے پھُول نہ کوئی ہے کلی — ساتھ جو اُسکے کھلے اس سے کرے ہمدردی
شاخِ نازک پہ سرِ شام سے کھلنے والے — یاد کرتے ہیں تجھے، خاک میں ملنے والے
میں نہ چھوڑوں گا تجھے واسطے مُرجھانے کے — دن گئے باغ میں پاکیزہ ہوا کھانے کے
کس لئے باغ میں اے پھُول تو تنہا ہے کھلا — تیرے ساتھی ہیں جہاں سوئے، وہیں پر سو جا
یہ عنایت ہے مری تیری ہر اک پنکھڑی کو — بسترِ خاک پہ ہوں جا کے سلاتا میں جو
شاخ گُل پر ترے ساتھی ہیں پڑے بے خوشبو — یہ تعجب ہے کہ کیوں رونقِ گلزار ہے تو

اب کہاں باغ میں ہیں آہ وہ تیرے ساتھی
مل کے مٹّی میں وہ افسوس ہوئے ہیں مٹّی

وہ جواہر جو چمکتے تھے بڑی شوکت سے — جب نکل جائیں وہی دائرہ اُلفت سے
سچے دل جب طپشِ مرگ سے کمھلا جائیں — اور محبّت بھرے ارمانوں کو مُردہ پائیں

جب مرے دوست مرے یار فنا ہو جائیں　　میرے ساتھی مرے غم خوار فنا ہو جائیں
بعد ان کے یہ تمنّا ہے کہ راحت پاؤں　　یہ مجھے چاہیئے، دُنیا سے میں رخصت ہو جاؤں
واقعی کوئی نہ دنیا میں رہے گا تنہا
اور تنہائی میں کیا لطف بھلا آئے گا

قیصر

خوش نصیب کون ہے

جو مرضی کا تابع نہیں ہے کسی کی — ہر اک رنگ سے جس کی حالت ہے اچھی
رہے ہر زمانہ میں جو نیک نیت — رہے راستی جس کی ہر وقت عادت
حکومت نہیں کرتے جذبات اس پر — نہیں بھاگتا جو کبھی خوف کھا کر
جو ہر وقت مرنے پر تیّار ہے وہ — جو دُنیا کے جھگڑوں سے بیزار ہے وہ
وہ بھوکا نہیں شہرتِ عام کا ہے — نہ طالب کسی طرح آرام کا ہے
نہیں ہے کسی کی ملامت سے ڈرتا — جو دل میں سماتی وہی کر گزرتا

نہ لوگوں پر اس کو ہے کچھ رشک آتا — نہ اس کا تصوّر وہاں تک ہے جاتا
جو قسمت سے عزّت میں سب سے بڑے ہیں — ملے اتفاقاً جنھیں مرتبے ہیں
دغابازیوں اور حق تلفیوں سے — خوشامد درآمد سے چالاکیوں سے

کسی کی نہ تعریف بے جا ہے کرتا — کسی پر نہ وہ مفت الزام دھرتا
نہیں کرتا ہے وہ کسی کی بُرائی — کسی کی ہتک کی نہیں دل میں آئی

وہ واقف نہیں ایسی عیاریوں سے
وہ آگاہ نہیں ایسی مکاریوں سے

نظامِ حکومت کے اسرار ہیں جو
برتتے ہیں اس کے طلب گار ہیں جو

نہ ان کی کبھی پیروی کرتا ہے وہ
نہ دم بھر کبھی ان کا دم بھرتا ہے وہ

اصُولوں سے نیکی کے واقف ہے کیسا
روش سے بھلائی کے واقف ہے کیسا

نہیں اس کو اس بات کی کچھ بھی پروا
خیال اُس کی نسبت ہے لوگوں کا اب کیا

سمجھتا ہے وہ دل کو اپنا جو ہادی
تو مرضی کا تابع نہیں ہے کسی کی

نہ طامع کو ہے ذات سے اس کی حاصل
نہ ظالم دکھا سکتا ہے اس کا کچھ دل

خدا کی عبادت میں مشغول ہے وہ
خدا کی حضوری میں مقبول ہے وہ

ہوتی رحمتِ حق ہے جب اس پہ نازل
تو لذّاتِ دنیا سے ہو کیوں نہ غافل

گنہ کے وہ کاموں میں جاتا نہیں ہے
عبادت کو اپنی گھٹاتا نہیں ہے

گیا وہ کسی دوست کے پاس آکر
تو باتوں میں ہے اس کی حق پر نظر

کتابوں سے دل اپنا بہلاتا ہے وہ
کہیں بھی نہیں آتا جاتا ہے وہ

غلامانہ پابندیوں سے بری ہے
ہر اک قول ہر بات اُس کی کھری ہے

نہ امید کچھ ہے ترقی کی اس کو
نہ کچھ خوف اپنے تنزّل کا اس کو

نہیں جائداد اس کے نزدیک کچھ ہے
مگر حاکمِ کل وہ دل کا ہے اپنے

بظاہر تو کچھ پاس اس کے نہیں ہے
مگر پھر بھی سب کچھ ہے اور سب یہیں ہے

عظمت اللہ خاں

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے مصیبت کے مارے کریں خودکشی
کہ دنیا میں دکھ کے سوا کچھ نہیں نہیں دکھ سے خالی یہاں خودخوشی
سو اس کے دکھ کی دوا کچھ نہیں
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے تو خوشیاں منائیں بلا روک ٹوک
کہ پھر جی کو مرنے کی دُگدا نہ ہو مٹے من چبھی دکھ کے کانٹے کی نوک
مرے بعد کا کوئی کھٹکا نہ ہو
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے تو خوشیوں کی قیمت بڑھے دس گنی
ہر اک کو خوشی کی ہی ہو لو لگی نہ ہو دھیان سے دکھ کے کوئی دکھی
بلا دکھ کی جس آن حد سے بڑھی
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — تو مٹ جائے یک لخت فکرِ خیال
مٹے اک بڑی ہی خرابی کا گھر — کہ پیدا اسی سے ہے دُکھ کا خیال
اسی نے دلوں کو بسایا ہے ڈر سے
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — نہ پھر مرنے والوں پہ روے کوئی
ہوئے جاں بحق دُکھ سے پائی نجات — کسی کے لئے جان کھوئے کوئی
نہیں اس میں یوں بھی کوئی ڈر کی بات
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — حقیقی محبّت بڑھے حق کے ساتھ
محبّت میں ڈر کا گزر ہی نہیں — رہے دل پہ ہر وقت خالق کا ہاتھ
کہاں دکھ جو مرنے کا ڈر ہی نہیں
مندے آنکھ بس بے خبر روح سووے

منصور احمدؔ

محبّت کا دن

رفعتِ گردوں سے صبح ایک سُنہری کرن
آتی لرزتی ہوئی کانپتی ڈرتی ہوئی
اور بکھرتی ہوئی لرزشِ سیماب پر
نہر کی ہر موج کے سینۂ بے تاب پر
جیسے محبّت سے چور ایک جھپکتی ہوئی
کوئی نگہ ڈال دے چہرۂ محبوب پر
ہوتی ہے یوں ابتدا عشقِ فسوں ساز کی
ہے یہ محبّت کی صبح زینۂ افلاک پر
کر گیا طے آفتاب فطرتِ روشن ہوئی
اس کی خواب بے حجاب وادی میں اک جوئے سیم
کروٹیں لینے لگی ندی کے پانی میں یا
نور کا چشمہ ملا یا کوئی کیف آفریں
خواب تھا جذبات کا

پھیلتا ہے بس یونہی نور محبّت کا بھی
عشق کے دن کا عروج عشق کا نصف النہار
آہ مگر آفتاب برلبِ بام آگیا
شام کا سایہ بڑھا اور فلک کی تمام
آن وہ رخصت ہوئی شان وہ رخصت ہوئی
نور کی وہ کیفیّت محو سراسر ہوئی
آہ کہ جذبات کی بدلی ہوئی آنکھ سے
کھوگیا سب اعتبار مٹ گیا سب ذوق وشوق
ہوتا ہے یونہی زوال عشق کی اقلیم میں
ہے یہ مُحبت کی شام

ہمایوں۔ ستمبر ۱۹۲۷ء

بادل

سمندر اور دریاؤں سے ننھی ننھی بوندوں کو
میں لاتا ہوں کہ تا سیراب کر دوں پیاسے پھولوں کو

نہ کیوں کر میرا ہلکا سا یہ ایسی پتیوں پر ہو
سلاجاتی زمیں پر دوپہر کی نیند ہے جن کو

وہ میرے بازوؤں سے قطرۂ شبنم بکھرتے ہیں
جو پیاری پیاری کلیوں کو شگفتہ آکے کرتے ہیں

چمکنا ان چٹانوں پر ہے سورج ہر گھڑی آکر
پڑی ہیں جن پہ وہ یوں، جیسے بچے ماں کے سینے پر

ہوا کے صاف کرنے کے لئے سنگین اولوں کا
فنائل کرتا ہوں تیار، جو ہے فائدہ دیتا

زمیں کے سبز میدانوں کو کرتا ہے سفید آکر
بدل دیتا ہوں اس کو منہ سے میں فرصت کبھی پاکر

یہ سمجھو خوب ہنستا ہوں کڑک کر جب گزرتا ہوں
زمیں کے واسطے میں آسماں پر پانی بھرتا ہوں

جماتا برف ہوں میں چوٹیوں پر ان پہاڑوں کی
جہاں صورت سفید ہوتی صنوبر کے ہے جھاڑوں کی

سفید اولوں سے رہتا رات بھر ہے بچھا مرا بستر
ہوا کے جھونکوں کی آغوش میں سوتا ہوں میں جاکر

ہر اک رخ پر مری تفریح گاہِ آسمانی کے   اک اندازِ متانت سے ہیں میرے ناخدا بیٹھے
جسے کہتے ہیں بجلی جب زمیں سے وہ گزرتی ہے   تو نیزروں کی طرح وہ ڈھاڑتی ہے زور کرتی ہے

سمندر اور زمیں پر، ناخدا میرا گزرتا ہے   یہ میری رہبری آہستگی کے ساتھ کرتا ہے
یہ جس کی چاہ میں ڈوبا ہے، دھن ہے جس ستمگر کی   وہ حرکت کرتا ہے گہرائی میں نیلے سمندر کی
وہ میدانوں، پہاڑوں، جھیلوں، چشموں اور دریا کی   پہاڑو بھی ہو کھو، دریا کی تہ ہو، جس جگہ ہو گھر
جہاں رہتا ہے وہ، ہر وقت اور ہے جس جگہ ہوتا   بلاتا ہے اسے اپنی طرف وہ ہے جہاں ہوتا
کشش وہ اس میں باقی رہتی ہے جس سے یہ کھچتا ہے   نہیں اس کو خبر ہوتی کہ صحرا ہے کہ دریا ہے
پڑا رہتا ہوں اس عرصہ تک اک بیکار فرصت میں   میں نیلے آسماں کی، اک تبسم خیز حدت میں
مجھے پانی کی صورت میں وہ پھر تبدیل کرتا ہے   مگر وہ اپنے کانوں میں بس اتنی ڈھیل کرتا ہے
چمکتا صبح کا تارا نظر سے جب ہوا اوجھل   بچھی سطحِ فلک پر سبزے کی جب خوش نما مخمل
سحر ہوتے ہی روشن، تیز سورج اگیا لے کر   چمکتی آنکھیں تاروں کی طرح اور اپنے جلنے پر
کمر پر میرے رعشہ دار تختہ کے چمکتا ہے   وہ اس تختہ پر آ کر، اس طرح اوچھالا کرتا ہے
کہ جیسے زلزلہ کے صدمہ سے ٹوٹا ہوا پتھر   ہوا میں جھولتا ہو کھا کے جنبش خیز اک ٹکر
اور اس پر اک عقاب نورا آکر بیٹھ جاتا ہے   پروں کی روشنی میں اپنے کچھ آرام لینے کو
سمندر کے منور سینہ میں جب دیکھ پاتا ہے   وہ اک جوشِ محبت، تو وہ اس میں ڈوب جاتا ہے
سمندر میں بڑے آرام سے جا کر وہ سوتا ہے   شفق گوں شام سے لے کر کفن جب دفن ہوتا ہے
میں اپنے بازوؤں کو بند کر کے تھام لیتا ہوں   ہوائی گھونسلہ میں جا کے پھر آرام لیتا ہوں
وہاں اک فاختہ طرح میں خاموش رہتا ہوں   اور اپنے خوابِ خوش انجام میں مدہوش رہتا ہوں

وہ شہزادی زمیں کی جو لدی ہے زیور سے   جسے انسانوں کی دنیا نے فانی چاند کہنی ہے

وہ میری نرم، اونی فرش پر ہے آکے پھیلاتی
بہت ہی شان و شوکت سے ٹھنڈی روشنی اپنی

اسے تم یوں سمجھ لو، وہ ہوا کھانے نکلتی ہے
ستاروں سے بھری جب وقت آدھی رات ڈھلتی ہے

وہ اسکے پاؤں کی آواز جس کو ہم نہیں سنتے
نکلتی توڑ کر ہے چھت کے خیمے کے مرے بخیے

ستارے اس کے پیچھے جھانکتے ہیں ناز کرتے ہیں
چمک کا اپنی اور اس کی بہت انداز کرتے ہیں

جب اپنی روشنی کو بے حقیقت پاتے ہیں بالکل
جب اسکے حسن کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں بالکل

سنہری مکھیوں کی طرح بھاگ اٹھتے ہیں پھر جیسے
لگا کر قہقہے ہنستے ہیں جن پر ابر کے ٹکڑے

کشادہ کرتا ہوں اپنے ہوائی خیمے کو جب میں
تو یہ خاموش دریا اور سمندر اور سب جھیلیں

منور روشنی سے میں ہر اک کا فرش پاتا ہوں
ستارے اور پیارے چاند سے میں جگمگاتا ہوں

محیطِ آتشیں سے تخت سورج کا بناتا ہوں
قمر کے تخت کو موتی کی جھالر سے سجاتا ہوں

مرے آگے یہ کوہِ آتش افشاں ہوتے ہیں دھندلے
ستارے ماند پڑ جاتے ہیں آتے ہیں نظر پھیکے

پھر بھی کھول دیتی ہے مرے جب بادِ طوفانی
تو پھر چاروں طرف آتا نظر ہے پانی ہی پانی

میں اک پل کی طرح قائم ہوں طوفانی سمندر میں سا
مقابل ہوتی ہیں آکر مرے سورج کی یہ کرنیں

لٹکتا رہتا ہوں چھت کی طرح سے جب ہوا پر میں
تو میرے واسطے اونچی پہاڑونکی ہیں دیواریں

زمیں نیچے اور پانی تلے کیا آرام جاں مجھ کو
کھلاتا گود میں اپنی ہے کیا آسماں مجھ کو

سمندر کے کناروں اور دہانوں سے گزرتا ہوں
فنا ہوتا نہیں صورت کو میں تبدیل کرتا ہوں

عظمت اللہ خاں

تریا چاہ

چلو آؤ بس ہو چکی جنگ پیارے　　نہ جھگڑیں نہ الجھیں نہ روئیں بس اب
محبت کا پہلا سا ہو رنگ پیارے　　ہوا جو ہوا آؤ سوئیں بس اب

کڑی بات کے طول کا کیا ٹھکانا　　ہمارا سرِ شام یوں بحثنا
کہ چڑیوں کا بے سدھ بسیرے کا غوغا　　ہو شاہیں ڈالی پہ پر تولتا

بڑھی آتی ہے موت ہر دم دبے پیر　　جھگڑنے میں اس کا نہیں کچھ خیال
ہٹاؤ یہ جھگڑے ہوا جو ہوا خیر　　گلے اب ملو گال پر رکھ دو گال

حقیقت ہے خود اک فریبِ تخیّل　　یہ سوچو تو میں اور تری بے وفا
گماں بھی ہو ابلیس دے گا جہاں جل　　نہ آنے بھی پائے ادھر کی ہوا

جہاں کھیت گندم کا دل کو بھائے　　وہاں سے نظر کو ہٹا لیجئے
کہیں ہاتھ سے عدن جانے نہ پائے　　نکلنا پڑے مثلِ حوّا مجھے

بنو دیوتا اور کرو رام مجھ کو　　زبردست منتر کوئی پھونک کر
بنو مردِ مستانہ لو تھام مجھ کو　　شکنجوں میں ہاتھوں کے لے کر کر

سکھاؤ پڑھاؤ کہ دمسازِ جاں ہوں　　مٹوں تم میں یاں تک یہ ہو جائے حال
جو بولوں تو گویا تمہاری زباں ہوں　　جو سوچوں تو وہ ہو تمہارا خیال

میں تیری ہوں جو کچھ مرا ہے ترا　　ذرا آنکھ تیری اشارا کرے
تو مرا خزانہ یہ روح و بدن کا　　جو چاہو کرو ہے حوالے ترے

ذرا چاہیے کچھ دنوں صبر ہم کو　　نہیں آج کی رات موقع نہیں
کہ پہلے مجھے دفن کرنا ہے غم کو　　تہِ دل سے نظروں سے اوجھل کہیں

بھر آیا ہے دل ہاں ذرا روئیں پیارے　　ٹھکانے سے ہو جائیں کچھ جو حواس
تو پھر چین سے اس طرح سوئیں پیارے　　مرا سر ہو بازو و دل کے پاس

رسا ہمدانی

قوسِ قزح

کیا طبیعت مری بہلتی ہے	جب دھنک چرخ پر نکلتی ہے
تھا یہی حال میرا طفلی میں	ہے یہی حال اب جوانی میں
ہو گا عالم یہی بڑھاپے کا	جب کہ پیغامِ موت آئے گا
طفلی آئینہ ہے جوانی کا	شوق ہے ایسی زندگانی کا
دن کٹیں زیست کے مرت سے
جذبۂ شفقت و محبت سے

قیصر

ایک چشمہ پر یہ الفاظ کُندہ تھے

یہ درخت انجیر کا اڑتی ہیں جس پر مکھیاں — رہتی ہیں جاری سدا بھن بھن کی آوازیں سدا
ایسے سایہ دار پیڑوں کو محبّانِ وطن — اپنی الفت کی نگاہوں سے بناتے ہیں چمن
سالخوردہ اسکی شاخیں مدتوں سے اے خدا — کچھ نہ دکھ پائیں، نہ کچھ نقصان اٹھائیں برملا
سائباں کی طرح وہ اس چھوٹے برتن پر رہیں — ابر بن کر موسمِ گل کا وہ گلشن میں رہیں
جس میں یہ نکلا ہوا پتھر بنا ہے پاسباں — چشمہ میں گرنے نہیں دیتا ہے سوکھی پتیاں
اس سبب سے اُس کا پانی صاف رہتا ہے سدا — مدتوں تک وہ یونہی بہتا رہے میرے خدا
اس طرح چپ چاپ یہ چشمہ سدا بہتا رہے — کوئی بچہ جس طرح سوتے میں کچھ کچھ سانس لے
اپنی دھیمی چال سے جائے تھکے ہاروں کے پاس — اسکے ٹھنڈے پانی سے بجھتی رہے پیاسوں کی پیاس
ریت کی رفتار میں کچھ تفرقہ پڑنے نہ پائے — اُس کی مخروطی روش میں کچھ تغیر ہو نہ جائے
کبھی اٹھلاتی ہوئی چلتی ہے جو موجوں کے ساتھ — ناچتی گاتی ہوئی چلتی ہے جو موجوں کے ساتھ
اس کے پانی کو رکھے ہر وقت صاف ابرِ بہار — تا نہ پیدا ہونے پائے اس کے دل میں کچھ غبار
ہے یہاں لُطف شفق بھی اور لطفِ سبزہ زار — کائی بھی اپنی دکھاتی ہے یہاں لطف بہار
مخملی ہے فرش سبزے کا، ہیں سایہ دار پیڑ — کس قدر گھیرے ہوئے ہیں اس زمیں کو چار پیڑ

چھان ڈالو اور چشمے یہ کہاں پانی ملے ساری دنیا میں نہ ایسے پیڑ کا ثانی ملے
دیکھنے والو اسے دیکھو خدا کا نام لو آؤ اور آکر یہاں پانی پیو، آرام لو
دل تمہارا ہے گناہوں سے اگر کچھ پاک صاف اور علاوہ راستی کے کچھ نہیں لاف و گزاف
تو تمہاری روح کو ہوگی مسرت بے کراں نرم اور نازک کسی آواز کو سن کر یہاں
مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور ہوا کے زور سے ڈالیوں کی سرسراہٹ پتیوں کے شور سے

دوڑ جائے گی تمہارے جسم میں رُوحِ نشاط
دل تمہارا شاد ہوگا پاکے ذوقِ انبساط

شانُ الحق حقی

خوفِ مرگ

یاد آتا ہے مجھے جب اپنا وقتِ واپسیں
سہمتا ہوں جب خیالِ مرگ بے ہنگام سے
سوچتا ہوں ناشگفتہ ہی نہ رہ جائیں کہیں
یہ شگوفے آہ میرے گلشنِ تخئیل کے

پھونک دے برقِ فنا شاید مری کشتِ حسیں
پیشتر اس سے کہ میرا خامہ گل چینی کرے

دیکھتا ہوں جب گھنے تاروں کی سیمیں چھاؤنیں
دُور پر حیرت، رفیع الشان رومانوں کے خواب
سوچتا ہوں دیکھئے کب ان کی تعبیریں ملیں
کھول سکتا کاش ان موہوم افسانوں کے باب

آہ لیکن مختصر ہیں زندگی کی ساعتیں
حسرتِ حاصل پہ دل کھاتا ہے کیا کیا پیچ و تاب

اور جب یہ سوچتا ہوں اے مری تسکینِ جاں
ڈالنی اک دن ہے تجھ پر نگاہِ آخری
پھر نہیں ہوگا تخیل یوں تری جانب رواں
پھر نہ یوں آنکھیں تری آنکھوں سے ملنے پائیں گی

آہ پھر الفت کا یہ آغوشِ فردوسی کہاں
خاک میں مل جائے گا اک دن یہ کیفِ عاشقی

تب میں ساحل پر محیطِ دہر کے تنہا کھڑا
دُور ہو کر این و آں سے غور کرتا ہوں ذرا
رفتہ رفتہ محو ہو جاتا ہے ہر سودائے خام
ہیچ رہ جاتے ہیں سب کیا عشق کیا پروائے نام

سید حشمت حسین حشمت

تصویر ماہتاب

اے ماہ رُخ یہ کیوں ترے زردی سی چھائی ہے
ہے داغ داغ چوٹ یہ کیا دل پہ کھائی ہے
کیا وجہ ہے جو رنج کی صورت بنائی ہے
جاتا کدھر ہے جی میں ترے کیا سمائی ہے
ڈرتا ہوں اس میں چال نہ ہو چرخ پیر کی
کیا تجھ پہ زد پڑی کوئی گیسو پڑ کے تیر کی

میرا بھی دل ہے بسکہ محبت سے آشنا
یہ پاگیا ہے تیرے قیافے سے غم ترا
بے شک تو ہے کسی کی محبت میں مبتلا
غماز رنگِ رُخ ہے، چھُپانے سے فائدہ
کس طرح رہ سکے گا نہاں مجھ سے غم ترا
مجھ کو کیا ہے حق نے شریکِ الم ترا
میں اور تو ہیں ایک بتا مجھ سے پردہ کیا
ملتا ہے کیا کسی کو محبت کا واں صلا

عاشق پہ یاں کی طرح تو ہوتی نہیں جفا
ہے لطفِ وصل یا غمِ ہجراں کا سامنا
معشوق اس جہاں کے بھی کیا پُرغرور ہیں
ہیں باوفا کہ راہ مروّت سے دُور ہیں
کیا اُن کے دل میں رہتی ہے خواہش یہ روز و شب
اُلفت کا دم بھرا کریں ان کی ہمیشہ سب
مری طرح سے رہتے ہیں کیا موردِ عتاب
پھنس جاتے ہیں جو دامِ محبت میں بے سبب
کیا عاشقوں پہ لُطف و عنایت گناہ ہے
کیا اس دیار میں بھی یہی رسم و راہ ہے

انوار علی خاں سوز

عالمِ یاس

(۱)

آسماں صاف ہے سورج تپش آمادہ ہے
ساز پر بادِ بہاری کی ہیں موجیں رقصاں
ہیں کہیں نیلے جزیرے کہیں برفیلے پہاڑ
خلعتِ نور میں ملبوس چو حوران جناں
گرد ہر غنچۂ نو رستہ کے ہے رقص کناں
مثل بھیگی ہوئی سانسوں کے ہوا تے گل زار
موج دریا کی ہواؤں کی پرندوں کی زباں
ایک ہی رنگ میں ہے چار طرف زمزمہ بار
شہر کا شور بھی گویا ہے خوشی بجنار

(۲)

ساحلِ بحر سے آتی ہے تہ بحرِ نظر
اور نمایاں نہ ہے تہہ بحر میں سبزے کا نکھار
موج ٹکرا کے بکھر جاتی ہے یوں ساحل پر

جیسے ہو نور کے بادل سے ستاروں کی پھوار
اور میں تنہائی میں ہوں محوِ تماشائے بہار
تابشِ مہر سے موجوں کا عجب عالم ہے
بجلیاں چاروں طرف میرے تڑپتی ہیں ہزار
موجِ مضطر کی جو آواز ہے اک سرگم ہے
آہ انساں مگر اس نغمہ کو سُنتا کم ہے

(۳)

زندگی میں مجھے حاصل ہے نہ صحت نہ اُمید
نہ مسرت کوئی ظاہر کی نہ باطن کا سکوں
اور نہ وہ گنجِ قناعت وہ خزانوں کی کلید
جس سے کھل جاتے ہیں درویش پہ اسرارِ دروں
اور ہو جاتے ہیں سرِ قیصر و دارا کے نگوں
اور نہ شہرت نہ حکومت نہ محبت نہ خوشی
سینکڑوں ہیں جنھیں حاصل ہیں نہ اسبابِ سکوں
زندگی وقفِ مے و سازِ طرب ہے ان کی
مہرباں مجھ پہ باندازِ دگر ہے ساقی

(۴)

مگر اس وقت ہے خود یاس بھی مائل بہ سکوں
نرم ہے موجِ ہوا بحر ہے آہستہ خرام
بسترِ ریگ پہ کیوں میں بھی نہ آرام کروں
زندگی کاٹ دوں روتے ہوئے تا صبح ز شام

ورنہ اب تک جو ہوا ہے وہی ہوگا انجام
موت پچکے سے مری سمت بڑھے صورتِ خواب
اور مرے ہاتھ سے لے توسنِ ہستی کی لگام
ہو دمِ نزع میسر مجھے آہنگِ رباب
یوں ہوں تا حدِ نظر رقص کناں موج و حباب

(۵)

کچھ مری موت پہ افسردہ ہوں شاید احباب
جیسے غمگیں ہوں ہیں اس شام کے ڈھل جانے پر
اور ہے افسردہ و بیتاب دلِ خانہ خراب
میری افسردگی توہین ہے فطرت کی مگر
میرے احباب کا غم اس سے ہو شاید بڑھ کر
یہ بھی ممکن ہے نہ ہو اشک فشاں مجھ پہ کوئی
یاد اس دن کی مگر نقش رہے گی دل پر
حسن میں اس کے کسی طرح نہیں کوئی کمی
میرے احباب ہمیشہ رہے مجھ سے شاکی

۶۱۹۵۵

نعیم الدین صدیقی

دنیائے خواب

جہاں دریا کی موجیں نُور کے آنسو بہاتی ہیں
جہاں سُورج کی کرنیں وادیوں میں منہ چھپاتی ہیں
جہاں چشموں پہ جل پریاں صف ماتم بچھاتی ہیں
وہ اُس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

اُسے بھاتی نہ تھی دنیا کی یہ ہنگامہ آرائی
رہا کرتی تھی اس کو جستجوئے کنجِ تنہائی
جدا بزمِ جہاں سے ہو کے وہ سوئے وطن آئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

نہ دیکھے گی وہ اب کہسار کی رنگیں بہاروں کو
سنہرے لالہ زاروں کو چمکتے آبشاروں کو
شفق کی سرخیوں کو صبح کے غمگیں ستاروں کو
وہ اُس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

ابد کی نیند سے اُس کو جگا سکتا نہیں کوئی
حجابِ ظلمتِ شب کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
سکوتِ موت پر آنسو بہا سکتا نہیں کوئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

انوار علی خاں سوز

قطعہ

ایک ذرّہ میں نظر آتی ہے دنیا ساری
ایک برگِ گل تازہ میں ہے جنّت کی بہار
اک کفِ دست میں آسکتا ہے کُل لامحدود
ایک ساعت میں نہاں ہے ابدیّت کا خمار

۱۹۵۵ء

غلام بھیک نیرنگ

جانِ شیریں

اے جان عزیز، جانِ شیریں
معلوم نہ ہو سکا تو کیا ہے
معلوم ہے بس یہی کہ مجھ سے
ہونا تجھے ایک دن جُدا ہے
پوشیدہ رہا یہ راز لیکن
کچھ کھل نہ سکا یہ بھید کیا ہے
کب، کس جگہ اور کس طرح سے
مجھ سے ترا وصل ہو گیا ہے

جب چھوڑ کے تن کے آشیاں کو
کر جائے گی تو کہیں کو پرواز
میرے اس سر کو، دست و پا کو
رکھ دیں کہیں خواہ میکر دمساز

کیا قدر رہے گی اس بدن کی
مٹ جائیں گے سب ادا و انداز
یہ حسن ہے وصل جسم و جاں تک
ہیں تیرے ہی دم سے عشوہ و ناز
اڑ کر جائے گی کس طرف تو
ہوگا کس باغ میں بسیرا؟
سوجھے گا نہ تیرا راستا بھی
نقش پا کا تو ذکر کیا تھا
اس طور سے مجھ میں اور تجھ میں
ہوگا جب تفرقہ یہ برپا
ڈھونڈوں پھر کس جگہ میں جا کر
اس چیز کو 'میں' ، ہے نام جس کا

مخزن دسمبر۔ ۱۹۰۵ء

حسرت موہانی

ترانۂ محبّت

وادیٔ کوہ میں وہ برف پہ چمکا جس دم
ماہ روشن کو نکلتے ہوئے دیکھا میں نے
اور کس قصد سے اس وقت اٹھائے تھے قدم
اپنے آہو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے

آگیا پاس مرے دوڑ کے کیوں کر آخر
ہو گیا قصد مرا کیسے ہرن پر روشن
میری دارفتگیٔ شوق سے واقف تھا مگر
آگیا کوچۂ جاناں میں جبھی تو یہ ہرن

مہر تابندہ سے جب گرم زمیں ہوتی ہے
یے دلی جوشِ مسرت سے بدل جاتی ہو

یادِ تکلیفِ جفا کاریِ سرما دل سے
آمدِ موسمِ گرما سے نکل جاتی ہو

مہرِ اُلفت سے تری جب سے ہوا دل روشن
نہ رہا نام و نشاں رنج و الم کا باقی
مہر سے بڑھ کے ہے خورشیدِ محبت کا چلن
اب نکل کر سوئے مغرب یہ نہ جائیگا کبھی

مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء

برقؔ دہلوی

شکستِ حُسن

اک حسینہ تھی رشکِ مہرِ منیر
حسن کی جیتی جاگتی تصویر

اس کی آنکھوں کا تھا عجب انداز
اس میں تھا جلوۂ تبسمِ ناز

وہ کرشمے نئے دکھاتی تھی
جاگتے سوتے مسکراتی تھی

جس سے اس کی نگاہ چار ہوئی
ایک برچھی سی دل کے پار ہوئی

اُس کی رعنائی کا تھا شہرۂ عام
ایک عالم تھا بندۂ بے دام

حُسنِ صورت سے تھا سُرور شراب
اس پہ طرّہ تھا عنفوانِ شباب

دو نشوں میں وہ چور رہتی تھی
مستِ ناز و غرور رہتی تھی

عجب اک روز اتفاق ہوا
جالا مکڑی کا اس سے ٹوٹ گیا

اس سے جالے کے تار جڑ نہ سکے
کوششیں کیں ہزار جڑ نہ سکے

رہ گئی شرم سے خجل ہو کر
بے بسی سے شکستہ دل ہو کر

ایک دن تھی وہ محوِ آرائش
جامہ زیبی تھی صرفِ زیبائش

ہاتھ سے آئینہ جو چھوٹ گیا
فرش پر گرتے ہی وہ ٹوٹ گیا

اس نے پھر لاکھ جوڑ توڑ کیے ٹکڑے پر آئینہ کے جڑ نہ سکے
رنگ فق ہو گیا خجالت سے دل میں شرمائی اپنی حالت سے
قلب صدمے سے پاش پاش ہوا خود نمائی کا راز فاش ہوا
اس نے چھیڑا ترانۂ رنگیں جس سے ہو قلب زار کو تسکیں
غرقِ نغمہ مگر الم نہ ہوا بڑھ گیا اضطراب کم نہ ہوا
جو حکومت دلوں پہ کرتی تھی جو زمیں پر نہ پاؤں دھرتی تھی
بے کسی پر وہ اپنی رونے لگی روتے صاف آنسوؤں سے دھونے لگی

نشۂ حسن کا اتار ہوا
نازِ بیجا مٹا قرار ہوا

مارچ ۱۹۲۴ء

ا۔ ع۔ شررؔ کاکوروی

فراقِ شوہر

چھوٹا سا مکان ہے سرِ راہ   نیچے کا برآمدہ ہے کوتاہ
بیٹھی ہے اس میں ایک عورت   نو عمر حسین ماہ طلعت
یہ افسرِ فوج کی ہے بی بی   بیٹی مشہور پادری کی
چہرے پہ شباب کی ہے رنگت   لیکن ہے اداس اس کی صورت
شاید ہے کوئی ملال دل میں   بے چین کوئی خیال دل میں
سنئے آتی ہے صاف آواز   کہتی ہے وہ آہ آہ دمساز
دو سال سے تو جدا ہے ہم سے   آتا نہیں کیا خفا ہے ہم سے
دنیا کے تمام عیش و عشرت   ہیں کلفت و رنج فی الحقیقت
پھیلا تھا ابھی ابھی دھواں کیا   تھا شامِ فراق کا سویرا
نکلا کتنی دن کے بعد خورشید   ہم کو تو نہیں تھی اس کی امید
خوش ہوں سورج سے اہلِ لندن   محبوب ہو ان کو روزِ روشن
ہے میری نظر میں تیرہ و تار   ہے دھوپ کہ زرد رنگ بیمار
یہ تیز شعاعیں میرے نزدیک   بے نور ہیں اور سخت تاریک
منظر روشن ہوا مجھے کیا   ہے اور ہی حال میرے دل کا

ہو دل کو سکون تو ہو فرحت — لیکن ایسی کہاں ہے قسمت
محبوب مجھے ہے میرا شوہر — اس سے نہیں کوئی چیز بڑھ کر
آئے گا وہ ایک سال کے بعد — پھر ہوگی خوشی ملال کے بعد
باقی ہیں مگر ابھی بہت روز — آتش ہے مفارقت کی جاں سوز
اس کی سچی دلی محبت — ظاہر جو ہوئی تھی وقت رخصت
آجاتی ہے یاد ہیں وہ سو بار — آنکھیں ہوتی ہیں مری خوں بار
وہ لطف وہ اس کی گرم جوشی — اب تک مجھ کو نہیں ہے بھولی
صدمہ ہے ملال ہے لقب ہے — اس کا ہی خیال روز و شب ہے
کرتی ہوں میں کاروبار گھر کا — ہے میرے سپرد سب علاقہ
بہلاتی ہوں روز کام سے دل — خوش ہوتا ہے اس کے نام سے دل
اس کے کمرے میں آ کے ہر روز — آہیں بھرتی ہوں میں جگر سوز
اس کی کرسی کو پا کے خالی — کلفت ہوتی ہے انتہا کی
آتی ہے نظر جو اس کی تصویر — پہروں کرتی ہوں اس سے تقریر
ہوتی ہے معاملات پر بحث — دنیا کی ہر اک بات پر بحث
سن کر اس کی دلیل کمزور — کمرے بھر میں مچاتی ہوں شور
اس کی ہر شے ہے مجھ کو محبوب — اس کا مطلوب میرا مطلوب
پڑھتی ہوں وہی کتابیں بھی — جو اس نے بشوقِ دل پڑھی تھی
تھے اس کو پسند جو رسالے — پڑھتی ہوں کلب میں منگا کے
آتے ہیں جب اس کے خاص احباب — کرتے ہیں دلا کے یاد بیتاب
کرتی ہوں میں دل سے انکی عزت — فرحت افزا ہے ان کی صحبت
خوش ہوتی ہوں میں بجا کے باجہ — رکھ دیتی ہوں پھر اٹھا کے باجہ

لگتا نہیں ایک کام میں دل — دن کاٹ رہی ہوں میں بمشکل
رہتی ہے عجیب طرح وحشت — ہے قابل دید مری حالت
جاتی ہوں جو سیرِ باغ کو میں — تازہ کرنے دماغ کو میں
کرتی ہوں ہر شجر سے باتیں — گل سے برگ و ثمر سے باتیں
ہوتے ہیں طیور جب نواسنج — بڑھ جاتا ہے اور رنج میں رنج
آجاتی ہیں یاد اگلی باتیں — گلگشت وہ گرمیوں کی راتیں
چلتی ہے جو سرد بادِ مشرق — آجاتی ہے دل میں یادِ مشرق
یعنی مشرق میں میرا شوہر — بنگال کی فوج میں ہے نوکر
دل کو ہے اتڑیا سے الفت — نامِ مشرق سے ہے محبت
اے کاش ہوا اڑا کے پہنچائے — بنگال میں مجھ کو جا کے پہنچائے
کرتی ہوں میں ختم سیر گلشن — آتی ہوں پلٹ کے سوئے مسکن
مغموم اداس گھر کے اندر — رہتی ہوں میں اشک بار و مضطر
پھرتی ہوں میں بے قرار گھر میں — رہنا ہے ناگوار گھر میں
گھنڈوں رہتی ہوں زار و نالاں — نوکر چاکر ہیں سب پریشاں
ہو جاتی ہوں پھر دعا میں مصروف — دل سے یادِ خدا میں مصروف
کہتی ہوں میں رو کے یا الٰہی — کر دور یہ فرقت و تباہی
یارب ہے یہ میرے دل کی خواہش — ہو ختم یہ وقتِ آزمائش
شوہر سے ہمارا گھر ہو آباد — پھر شاد ہوں دردمند ناشاد
پھر گھر میں بہارِ باغ آئے — گردش میں بھرا ایاغ آئے
کلفت فرقت سے پھر بدل جائے — دل میں جو رنج ہے نکل جائے

جلسے ہوں نشاط ہو خوشی ہو
احباب ہوں اور دل لگی ہو

جاذب دہلوی

چاند اور سمندر

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

بپا ہوتا ہے طوفانِ تمنا میرے سینے میں
شعاعیں قلزمِ دل میں تری جب مسکراتی ہیں

ترے جلووں سے ہم آغوش ہوتی ہیں مری چھبیاں
چٹانیں اضطرابِ زندگی میں ڈوب جاتی ہیں

تو جب رُو پوش ہوتا ہے مرا دل بیٹھ جاتا ہے
پُرانی صحبتیں اُس وقت اکثر یاد آتی ہیں

اندھیری رات کے منظر سے میرا دل لرزتا ہے
مجھے کالی چٹانیں ہر طرف آنکھیں دکھاتی ہیں

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

طالب بنارسی

دولت

مرا جاتا ہے پُتلا خاک کا فکرِ معیشت میں
اَڑی ہے سانس لیتے ہیں دھری ہے جان دولت میں

جسے دیکھو اُسے سودا ہے دُنیا میں امارت کا
لگا دیتا ہے اپنا نقدِ جاں بھی اسکی قیمت میں

مگر ہے جنسِ دولت کون سے بازار میں ارزاں
گراں مشتری اکثر پڑا رہتا ہے غفلت میں

کوئی کہتا ہے دولت صنعت و حرفت میں ملتی ہے
کوئی کہتا ہے یہ سودا ہے بازارِ تجارت کا

کوئی کہتا ہے دولت دستِ قدرت سے نکلتی ہے
اسی کے ہاتھ چڑھتی ہے یہ اتری جسکی قسمت میں

یہ باتیں کھوٹے سکوں کی طرح خود چل نہیں سکتیں
مجازاً راست ہوں لیکن یہ جھوٹی ہیں حقیقت میں

جہاں لہو و لعب ہے واں کبھی دولت نہیں ہوتی
جوئے میں ہے نہ ہے بلوے کے بل میں یا زراعت میں

جو ہے مہماں سرائے عام وہ کبھی گھر نہیں اُس کا
عبث کھاتا ہے دھوکا میزباں اس کی سکونت میں

جہاں بزمِ حسیناں ہے، جہاں روئے درخشاں ہے
وہاں دولت نہ معنی میں ہویدا ہے نہ صورت میں

کرن جوتی میں، ٹوپی میں جہاں سلما ستارے ہیں
وہاں بھی مہرِ دولت آ نہیں سکتا ہے ظلمت میں

اگلتی ہے زمیں دولت، نہ بن بن کر برستی ہے
یہ پھل لگتا ہے اے طالب فقط نخلِ ریاضت میں

حکایت برسبیل تمثیل

روایت ہے قدیمی اس طرح ظاہر کتابت میں ... کہ تاجر کا کوئی بیٹا تھا مشرق کی ولایت میں
وہ تاجر خاندانی تھا یہ ننگِ خانداں بھی تھا ... گھرانے کا بڑا تھا خود مگر تھا چھوٹی رقت میں
بزرگوں سے چلی آتی تھی ترکے میں جو عیاشی ... مٹا دی جائداد اپنی جو پائی تھی وراثت میں
دعا تھی یا الٰہی دے تو چھپر پھاڑ کر مجھ کو ... کڑی چاندی کی سل ہو لعل لگ جائیں مری چھت میں
کوئی سونے کی چڑیا ہاتھ آجائے تو چاندی ہے ... کہیں سونا میسر ہو، کنارِ سیم طلعت میں
دعائے غیر واجب نے نہ کچھ تاثیر پیدا کی ... نہ ابھرا ڈوب کر وہ شخص دریائے فلاکت میں
کنارا کر گیا ساغر جو شیشہ ہو گیا خالی ... نہ ٹھہرا ہم پیالہ ہم نوالہ کوئی صحبت میں
وفورِ غم میں تسکیں دینے کو آنسو نکل آئے ... یہی تھے دوست جو کچھ کام آئے اس مصیبت میں
یہی کہتا تھا ہر دم با دلِ مضطر کہ اے داور ... نہ بھولے گا کوئی گُل کیا کبھی اس نخلِ حیرت میں
لحد میں ہو گیا جو دفن ساتھ اپنے دفینے کے ... الٰہی کیا یہ دولت تھی اسی قاروں کی قسمت میں
جوانی میں ملے دولت تو لُطفِ زندگانی ہو ... جواب دیتا نہیں یارب تو کیا دیگا قیامت میں
تحکّم کیا اٹھائے جاہ کا جو شخص خوگر ہو ... غضب ہے اس پہ عسرت، رہ چکا ہو جو کہ عشرت میں
خیالِ خام نے اس کو کیا آشفتہ سراپا ... کہ مجنوں ہو رہا تھا، الفتِ لیلیٰ دولت میں
اسی اُلجھن میں آخر آنکھ اس کی لگ گئی دم بھر ... تو کیا دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے خوابِ غفلت میں
کہ اے تاجر عبثِ گردابِ کلفت میں نہ دھوکے کھا ... سرِ بالیں ہے آب اور تو پڑا ہے بحرِ حیرت میں
اسی تیرے مکاں کی زیرِ دیوار اک دفینہ ہے ... کہ جس سے گنجِ قاروں بھی نہیں ہم ہے کثرت میں
اٹھ اور کھدوا زمیں قبضہ کر اپنا اس خرابے پر ... نہ آئے گردِ نکبت اب ترے ایوانِ راحت میں
ہوا جب وہ حریص اس خواب سے بیدار تو فوراً ... دکھا دی پختگی اس خام نے اپنے ارادت میں
غرض کھدوائی پر دیوار کی بنیاد تک اس نے ... مقدّر نے دکھایا قہرِ پستی حرص رفعت میں
اٹھایا فائدہ آخر ہوس کا یہ کہ کھد کھد کر ... وہ گھر بھی گر پڑا سب جو بنا تھا ایک مدت میں
ہوائے زر میں ایسا ہو گیا تھا آپ سے باہر ... کہ گھر بھی کھو دیا آفت بپا کی اور آفت میں

لگا وہ بوالہوس سر پیٹ کر آہ و بکا کرنے   صدائے غیب آئی، ناگہاں اس کی سماعت میں
کہ اے غافل تجاہل چھوڑ دے محنت مشقت کر   پس اندازی کو تھوڑی راہ دے اپنی طبیعت میں

اگر دولت کی حسرت ہے تو اس کی قدر لازم ہے
کلامِ لایحب اللہ للمسرف ہے آیت میں

مخزن۔ جنوری ۱۹۰۶ء

سرور جہاں آبادی

مرغابی

ڈھل گیا دن اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز
گوشۂ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
پڑ رہی ہیں دور تک سورج کی کرنیں زرد زرد
جا رہی ہے تو اکیلی شام کو اڑتی کہاں

دیکھتا ہے کیوں عبث صیاد سوئے آسماں
یاس کی نظروں سے تیری شوکتِ پرواز کو
ارغوان زارِ فلک کے منظرِ خوش رنگ نے
کر دیا ہے اور دلکش تیرے نقشِ ناز کو

ڈھونڈھتی پھرتی ہے کیا کوئی سہانا آبشار
یا کہ سرگرمِ تلاشِ دامنِ دریا ہے تو
یا کسی بحرِ تموج خیز کی ہے جستجو
یوں سکوتِ شام میں کیوں آسماں پیما ہے تو

تو جو بے سنگِ نشانِ جادہ و بے مرحلہ
کر رہی ہے آسماں پر قطع طبقاتِ ہوا
اڑ سکے بے بدرقہ تو یہ کہاں تیری مجال
کوئی طاقت ہے مگر تیری مقرر رہنما

اے سبک پرواز تیری سُرعتِ پرواز نے
طے کیے کتنے ہی دن بھر سرد طبقاتِ نسیم
ہو کے درماندہ زمیں پر گر نہ شہپر جوڑ کر
شب کی ظلمت کا ہے گرچہ سر پہ طوفانِ عظیم

ہو چکی تیری مشقت ختم تجھ کو عنقریب
گرمیوں کا اک سہانا گھر ملے گا خوش گوار
گاتی ہو گی چھوٹی چڑیوں میں ہم آہنگی سے تو
اور نشیمن پر ترے ہو گی نیستاں کی بہار

ہو گئی غائب فضائے آسماں میں گرچہ تو
اور اب آنکھوں میں ہے ترا تصور یادگار
میں نے سیکھا ہے سبق لیکن تری پرواز سے
ہے طریقِ زندگی میں تو مری آموزگاہ

منطقہ سے منطقہ تک اے سبک پرواز شوق
وسعتِ اوجِ فلک پر ہے جو تیرا راہبر
مجھ کو بھی لے جائے گا وہ منزلِ مقصود تک
جب کروں گا جادۂ ہستی سے میں تنہا سفر

مخزن۔ ستمبر ۱۹۰۸ء

برق دہلوی

پھول

پھول کیا ہیں دلِ مایوس کی امیدیں ہیں
یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے
سب کی پیاری ہے یہ مخلوق مگر ربِ قدیر
پھونکنی بھول گیا روح بدن میں ان کے

ہم سے تو کرتے ہیں یہ پھول اشارے ہی فقط
آسماں اور خدا سے ہیں یہ محوِ تقریر
ہو کے آوارۂ دامانِ فضا نکہتِ گل
اپنی شیرینی کی کرتی ہے دو بالا تاثیر
مست و بے تاب رہا کرتی ہے یوں موجِ نسیم
جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

چرخ پر تاروں میں بالائے زمیں پھولوں میں
نام لکھتا ہے قلمِ کارِ حقیقی اپنا

پھول ہیں مادرِ قدرت کی زبانیں گویا
جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبت افشا
پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں دامانِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سنہری ہیں یہ پیارے پیارے

اس لئے کھلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہوکر
بوئے شیریں سے معطر کریں بادِ صحرا
گل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی وہ گہرہائے امید
جو یہ کہتے ہیں ہمیں بھول نہ جانا اصلا
پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرت کا پیام
جلوۂ حسن کا، موسیقی و نکہت کا پیام

فروری ۱۹۲۲ء

تلوک چند محروم

سپاہی کا خواب

دورِ افق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام — دینے لگی صدائے بگل امن کا پیام
پہرے پہ مستعد جو کواکب ہوتے تمام — فرشِ زمیں پہ لشکریوں نے کیا قیام
جو تھک گئے تھے مائلِ خوابِ گراں ہوئے
گھائل جو تھے وہ ملکِ عدم کو رواں ہوئے

میں بھی گیاہِ وقت کے بستر پہ سو گیا — روشن وہیں الاؤ پئے دفعِ گرگ تھا
دی تھی وہ آگ ہم نے سرِ شام ہی جلا — لاشیں نہ کھوتی جائیں یہ تھا اس سے مدعا
آدھی بچی تو خواب وہ دیکھا کہ واہ رے
تا صبح تین بار وہ آیا نظر مجھے

دیکھا کہ دور ہوں میں صفِ کارزار سے — صحرا کو کاٹتا ہوں کسی رہگزار سے
ظاہر اثر خزاں کا ہے ہر شاخسار سے — سورج عیاں ہوا ہے ابھی کوہسار سے
اور میں رواں ہوں جانبِ کاشانۂ پدر
لیتا ہے وہ بلائیں مری رہ میں آن کر

جب کھیت وہ سہانے سہانے نظر پڑے جو سیر گاہ تھے مری فصل شباب کے
بے اختیار دوڑ پڑا فرطِ شوق سے نقشے پرانے سب مری نظروں میں پھر گئے

آواز بکریوں کی وہی تھی چٹان پر
جاری وہی تھے گیت کسان کی زبان پر

پہنچا میں اپنے گھر جو بصد شوق بے قرار مل مل کے مجھ سے روتے تھے احباب زار زار
وعدہ کیا کہ اب میں نہ جاؤں گا زینہار سب نے بطورِ عہد پیا، جام خوش گوار

بچوں نے چوم چوم کے جتلائیں اُلفتیں
بیوی نے آہ کھینچ کے کیں لاکھ منتیں

للہ اب نہ جاؤ یہاں سے یہیں رہو کافی ہے، ہیں رنج بلا میں نہ اب پھنسو
جھیلیں ہیں سختیاں بہت اکرام بھی تو لو میں خستہ جاں بھی سُن کے یہ بولا کہ جو کہو

لیکن نمودِ صبح نے مجھ پر ستم کیا
بیوی تھی وہ، نہ بچے، تھے اور نہ آشنا

مخزن۔ اپریل ۱۹۱۲ء

محمد حسین آزاد

معرفتِ الٰہی

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش ۔۔۔ فصلِ گل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کنجِ غم میں ہو بے کار ۔۔۔ گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار

لطفِ صحبت بہم غنیمت ہے ۔۔۔ میاں آزاد دم غنیمت ہے

چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر ۔۔۔ گل و گلزار و یاسمن کی سیر

گرچہ بہرِ عوام کالانعام ۔۔۔ لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام

پر کرو دل میں تم جو اپنے غور ۔۔۔ ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور

نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط ۔۔۔ قصہ کا اپنے بھی اثر ہے شرط

سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں ۔۔۔ کہ بری خلق کے گماں میں ہیں

صرف ہووے گر اس میں حسنِ خیال ۔۔۔ تو ہو پھر نقص اس کا عینِ کمال

گل و سنبل سے تا خس و خاشاک ۔۔۔ خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک

رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی ۔۔۔ نہیں عبرت سے کوئی شے خالی

ہر ورق ہے تجربہ بہرِ حساب ۔۔۔ بکفِ دست موعظت کی کتاب

گوشِ عبرت نہیں تو کھوتا ہے ۔۔۔ ورنہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے

ہر زباں برگ گوش دل گل ہے ۔۔۔ تو ہی مدہوش نشۂ مُل ہے

ایک دن دل جو میرا گھبرایا — کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردہ غنچہ دار مرا — ہوا گلزار میں گزار مرا
پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا — پا کے اک جا درخت کا سایا
بیٹھا میں برکنارِ آبِ رواں — کہ ہے عمرِ رواں حبابِ رواں
کی جو یک بار آنکھ اٹھا کے نظر — برگ اک ٹوٹ کر زشاخِ شجر
اترا اوپر سے جوں پیامِ سروش — اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال — پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشمِ بینا ہے — تو یہ قدرت کی لوحِ مینا ہے
نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ — دیکھ ان کو بچشمِ اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع — کلکِ صنعت کا ہے نگارِ بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا — تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیض آب اور باد کی نرمی — اس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادرِ خاک سے ہوئے دوچار — روح جنبش میں آگئی یک بار
منہ کو گردِ عدم سے صاف کیا — سینۂ شاخ کو شگاف کیا
سبز کونپل تھا جب نکالا سر — پر وہ کونپل تھی غیرتِ گلِ تر
کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا — دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یمنِ قدم یہ آیا راس — ہو گیا ہر درختِ خضر لباس
زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے — گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے
بار مجھ بن نہ زینہار آتا — پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاج سر میں پہنے نہال ہوا — مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
خسروِ گل کا جب قشون آتا — مرا پرچم تھا پہلے لہراتا

سب کے سر پر تھا نخل کا سایا
ہرا سایا تھا نخل پر چھایا

جس سے سارے جہاں کو راحت تھی
ہر مسافر کو استراحت تھی

شاخِ گل تھی ہری بھری مجھ سے
زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے

تھے رفاقت سے میری سرو آزاد
مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد

چشمِ نرگس چمن کا جوبن تھی
برگ گویا زبانِ سوسن تھی

ساری ذات و صفات ہے مجھ میں
گل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں

کون سی بات مجھ سے چھوٹی ہے
مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے

مرہمِ زخمِ جان و خاطرِ ریش
برگِ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

عزیز الرحمٰن بلگرامی

کُلُّ شَیٍٔ ھَالِکٌ

سامنے آنکھوں کے دریا سبز لہراتا ہوا　　ناز سے جھونکا نسیمِ صبح کا آتا ہوا
برف کی وردی میں لشکر ابر کا جاتا ہوا　　موسمِ گلہائے رنگیں، دل کو تڑپاتا ہوا
اپنے اپنے وقت پر ہر اک فنا ہو جائے گا
دیکھ لینا چار دن میں کیا سے کیا ہو جائے گا

پھر نہ بحرِ نیل گوں اس لطف سے لہرائے گا　　نے کوئی جھونکا ہوا کا باغ میں ہرائے گا
ابر کا ٹکڑا اُنک صورت نہ پھر دکھلائے گا　　شیشۂ دل سنگِ ناکامی سے ٹکر کھائے گا
نام رہ جائے گا باقی بس خدائے پاک کا
نقش وہ مٹ کر رہے گا جو بنا ہے خاک کا

جا چکی ہم سے ہمیشہ کے لئے فصلِ بہار　　موت دروازے پہ کرتی ہے ہمارا انتظار
چھوڑتے جاتے ہیں بزمِ عیش یارو غمگسار　　ہم کو بھی جانا پڑے گا ہو گی جب اپنی پکار
گردشِ فرخِ بریں نیچا ہمیں دکھلائے گی
مادرِ گیتی ہمیں آغوش میں بٹھلائے گی

جس جگہ احباب کی اپنے رسائی تک نہیں　　بزمِ عشرت کی صدا جس گھر میں آتی تک نہیں
نغمۂ بلبل جہاں دیتا سنائی تک نہیں　　بھول کر جس جا نسیمِ صبح آتی تک نہیں
ایسے ویراں گھر میں ہم کو چھوڑ جائیں گے عزیز
بعدِ مردن ہم نہیں گویا رہے ان کے عزیز

عالمِ پیری ہے چہرہ ہو گیا ہے زرد فام　　دانت رخصت ہو گئے بازو نہیں دیتے ہیں کام
جسم ٹھنڈا ہو گیا ہے موت کا پہنچا پیام　　کوسِ رحلت بج گیا اپنا بھی یارو والسلام
مادرِ گیتی یونہی اک دن فنا ہو جائے گی
چار دن میں آب و تاب اس کی ہوا ہو جائیگی

ہم نہیں دنیا میں جب بادِ نسیم آیا کرے　　موجِ بحرِ نیلگوں سر اپنا ٹکرایا کرے
صبحِ عشرت آسماں سے نور برسایا کرے　　شامِ وصلت عاشقوں کو لطف دکھلایا کرے
ہم کو کافی ہے زمیں دو ہاتھ سونے کے لئے
فرشِ خاکی خوب ہے اپنے بچھونے کے لئے

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

ایک ممی سے خِطاب

۱

ترا قصّہ تعجب خیز ہے کوچوں میں تھیبس کے
لگائے تو نے ہیں چکر ہزاروں سال کے پہلے
شکوہ و عظمتِ ممونیم معراج کامل تھی
ابھی بربادیاں ہونے نہ پائی تھیں زمانے کی
محلّات و منادر شوکت و عظمت بداماں تھے
کھنڈر بھی باقیماندہ حیرت افزا ہیں یہاں جن کے

۲

خدارا بات کر، مدت سے تو محوِ خموشی ہے
زباں تو ہے اپر اس کے نغمہ پر کیوں پردہ پوشی ہے؟
زمیں پر اے ممی! پھر تو کھڑا ہے اپنے پاؤں پر
ترے آگے دوبارہ چاندنی کا ہے وہی منظر
مگر تو ہستی بے جسم ہے کوئی نہ سایہ ہے
وہی ہے گوشت اور ہڈی، وہی اعضا ہیں ڈھانچہ ہے

٣

بتا بے شبہ ہاں تجھ کو ضرور اب یاد تو ہوگا
کہ ہم بوالہول کی شہرت کا رکھیں کس کے سر سہرا؟
حقیقت سفری نس کی یا کیف کی الغرض ہے کیا
تعلق نام رکھتا کس سے ہے اہرام مصری کا
غلط ہے کیا منارِ پامپی منسوب ہے جس سے
بیاں ہومر کا سچ ہے اتھیبس کے کیا سو تھے دروازے

٤

یہ ممکن ہے کہ تو ہیمن ہو اپنی زندگانی میں
قسم کیا تجھ کو ہے افشائے اسرار نہانی میں
بتا! ممنن کے ہیکل میں تھے ایسے کون سے نغمے
موید جو بنا کرتے تھے رقص صبح گاہی کے؟
ہے ممکن، ہو تعلق مذہبی فرقہ سے کچھ تجھ کو
تو کیسے ان کے بھیدوں سے ہمیں پھر واقفیت ہو

٥

وہی ہاتھ آج جو بیجاں ڈھانچہ سے بندھا پایا
ہے ممکن محفل فرعون میں ساغر بکف ہوگا
کبھی ہومر کی ٹوپی میں اسی نے ٹالا ہو پیپا
گزرگاہِ کو تن ڈیڈو پہ ہو تعظیم کو اٹھا
سلیماں کے اشارے سے بہ نذرِ مسجدِ اقصےٰ
اسی نے مشعلوں کو غالباً اونچا کیا ہوگا

۶

یہ کیا پوچھوں جو تیرے ہاتھ میں ہتھیار رہتے تھے
تو کتنے روم کے سرباز اس نے مار ڈالے تھے
ابھی ریمس و ریموس نہیں پیدا ہوئے ہونگے
کہ تیرا مردہ محنوط ہو گا قبر کے نیچے
ہماری نسل کی بھی آفرینش سے بہت پہلے
ترے افراد دنیا سے کبھی کے اٹھ گئے ہونگے

۷

زباں سکڑی ہوئی تیری اگر مہر دہن توڑے
تو ہم جانیں کہ کیا دیکھا تھا ان بے نور آنکھوں نے
نظر کیسا یہ آیا ہو گا جب عالم جواں ہو گا؟
جسے طوفان اعظم نے ابھی تر کر کے چھوڑا تھا
جہاں اس وقت بھی، یا تھا قدیم اتنا کہ تھے قاصر
ورق تاریخ کے، تا ہو بیانِ ابتدا ظاہر

۸

ارادہ کیا ہے اب ہے خاموش اب تک بے زبانی ہے؟
قسم کھائی ہے کیا کوئی؛ چھپانے کی جو ٹھانی ہے
برائے مہربانی اے ممی! کہہ کچھ تو اپنی بھی
کوئی تو بات ظاہر کر تو اپنے قید خانے کی
ابھی تک عالم ارواح میں لی تو نے نیندیں تھیں
بتا کیا کیا وہاں دیکھا ہمیں کس قدر سر کہیں؟

۹

ترے مردے کو اس صندوق میں رکھا گیا جب سے
زمین پر آج تک ہم نے عجب ردو بدل دیکھے
بنی بھی سلطنت رُوما کی اور آخر کو بگڑی بھی
نئی دنیا ملی، ہم نے پُرانی قوم کو کھو دی
مرے گو حکمراں بے حد ملے مٹی ہیں گو صدہا
پہ تیرے گوشت میں سے ایک ٹکڑا بھی نہیں گڑا

۱۰

مچا ہنگامہ محشر ممی! اگرچہ ترے سر پر
جب ایرانی شہنشہ کمبی سس نے فوج کو لیکر
ترے مدفن کو روندا، آمرس، آرس، اپس لوٹا
کیا زیر و زبر اے سس کو بھی، پر تو نہیں جاگا
ہلا اہرام کو ڈالا سبب سے خوف و حیرت کے
پُرعظمت شہر ممنن کے درو دیوار سب ٹوٹے

۱۱

نہیں کہنے کی باتیں ہیں اگر اسرار قبروں کے
تو اپنی زندگی کی نوعیت ہی کو تو بتلا دے
ترا دل حرکتیں کرتا تھا جب اس سینہ کے اندر
ترے گالوں پہ بہتے تھے جب آنسو آنکھ سے گر گر
کبھی بچے بھی ان گھٹنوں پہ چڑھنے پیار کرتے تھے
ترا نام و نشاں، عمر اور پیشہ کچھ تو بتلا دے

۱۲

سراپا گوشت کے پتلے کہ تو مر کر بھی زندہ ہے

اورائے فانی جہاں کی ایک باقی رہنے والی شے

تو اپنا تنگ مرقد چھوڑ کر اے موت کے زندے

ہمارے سامنے آکر کھڑا سالم ہے اب پھر سے

تجھے صبح قیامت تک پڑے گا منتظر رہنا

کہ اس دن صُور اسرائیل سے تو پھونک جائے گا

۱۳

جب اپنے غیر فانی میہماں کو کھو دیا اس نے

تو پھر بے فائدہ ہو مادہ باقی لئے کس کے ؟

ہمیں تو چاہیئے رُوح اپنی ہو محفوظ اور خرم

کہ اپنے جسم سے اس کو جدا ہونا پڑے جس دم

تو گر روندن زمانے کی مٹا دے نام کو اپنے

ہماری غیر فانی روح بالائے فلک چمکے

انوار علی خاں سوز

آخری ہم رکابی

(۱)

"جانِ من" میں نے کہا "جب یہ مقدر ہو چکا"
ہو چکا معلوم مجھ کو میری قسمت کا لکھا
جب یہ ظاہر ہے کہ ہے میری محبت رائیگاں
جب یہ ظاہر ہے کہ ہستی ہے میری رہن زیاں
جب کہ قسمت میں یہی تھا اور یہی ہو کر رہا
دل سے اب بے ساختہ میرے نکلتی ہے دعا
از رہِ فخر و تشکر نام لے کر آپ کا
آرزوئیں آپ نے بخشی تھیں جو لے لیجئے
ان کی شیریں یاد ہی کافی ہے بس میرے لئے
اور اتنا گر نہ ہو یہ بارِ خاطر آپ کے
اسپ جولاں پر مجھے ہو قرب حاصل آپ کا

(۲)

سُن کے میری التجاؤں کو جھکا یا فرقِ ناز
تھی غرورِ حسن سے مدہوش چشمِ نیم باز
جذبۂ رحم و کرم بھی تھا مگر سرگرم کار
جنبشِ لب پر تھا ان کی میری قسمت کا مدار
ناگہاں سر کو اٹھایا اور فرمایا کہ "ہاں"
پھر عروقِ مردہ میں خوں بن کے دوڑی زندگی
آخری خواہش کم از کم میری لاحاصل نہ تھی
ملکۂ اقلیمِ حسن اور اک گدائے بارگاہ
اسپ جولاں پر کریں پہلو بہ پہلو قطعِ راہ
آج پھر میرا مقدر ہو گیا پروین کلاہ
کاش پوری آج ہی ہو جائے عمرِ کن فکاں

(۳)

جانبِ مغرب بوقتِ شام جیسے ایک سحاب
جس کے سینہ کا تلاطم ہو مثالِ موجِ آب
اپنے پہلو میں چھپائے سینکڑوں رنگینیاں
چاند سورج شام کے تاروں کی نور افشانیاں
اور کوئی دیدۂ عاشق سے دیکھے یہ سماں
فرطِ استغراق میں ہو جائیں اس کے ہم رکاب
بدلیاں تارے ابھرتا چاند چھپتا آفتاب
ہر گھڑی ہوتے رہیں نزدیک سے نزدیک تر

اس قدر نزدیک گویا خلد ہے پیشِ نظر
کتنی بے پایاں مسرت کس قدر خوف و خطر
اک گھڑی بھر کی ہم آغوشی میں تھا کیا کیا نہاں

(۴)

ہم رکابی تھی گھڑی بھر کی کہ تھا کوئی فسوں
اضطرابِ دل یکایک تھا ہم آغوشِ سکوں
جیسے مرجھاتی ہوئی کلیوں پہ افسوں بہار
جن کے دامن میں ہو ماضی کی امیدوں کا مزار
یاد سے اب جن امیدوں کی کوئی حاصل نہیں
کیا یہ ممکن ہے اگر میں اور کرتا التجا
کامرانی حسرتوں کی اور ہو جاتی سوا
کون جانے رحم آجاتا انھیں بیمار پر
کون جانے اور ہو جاتی عتاب آگیں نظر
اور وقفِ یاس ہو جاتی حیاتِ مختصر
ہم رکابی کیا مری یہ رشک کے قابل نہیں

(۵)

کیا نہیں ناکام کوئی دہر میں میرے سوا
کیا ہر اک راہی کو مل جاتا ہے منزل کا پتہ
ہم رکابی جب مجھے اے دوست حاصل ہو گئی
ہر قدم پر روح لذت گیرِ منزل ہو گئی
محوِ رقصِ بے خودی تھی ہر دو جانب کائنات

کارگاہِ دہر میں اے نکتہ سنجانِ کتاب
کتنے مصروفِ عمل ہیں اور کتنے کامیاب
مانتا ہوں لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
پھر بھی کتنوں کو بقدرِ سعی ملتا ہے صلا
حسرتیں ہوتی ہیں کیا حاصل ہوا کرتا ہے کیا
میرا حاصل ہم رکابی میری حسرت وصلِ ذات

(۶)

کس تصوّر کو نہیں تصویر سے اپنی گلہ
کون سا وہ دل ہے جس کا حوصلہ پورا ہوا
کس عمل میں آسکا ہے فکر کا عکسِ تمام
کس ارادے کی نہیں دستِ مشیت میں لگام
حسن کی موجوں کا میرے سامنے تھا زیر و بم
آرزو ہوتی ہے جن کی بام گردوں پر اڑیں
صفحۂ تاریخ میں دو سطر ملتی ہیں انھیں!
نصب ہوتا ہے علم جن ہڈیوں پر فتح کا
کیا صلہ ملتا ہے ان کو دہر میں اس کے سوا
لوحِ تربت کا نوشتہ "یہ شہید قوم تھا"
ہم رکابی ہے میری کیا ان کے بھی حاصل سے کم

(۷)

اور کیا اس کے سوا ہے ذہنِ شاعر کا کمال
جلوہ گر ہے شعر میں اس کے ہمارے دل کا حال

ہم فقط محسوس کر سکتے ہیں کہہ سکتے نہیں
شعر میں ہوتی ہے ارمانوں کی فردوس بریں
حسن کی الفاظ ہیں صورت گری ہے شاعری

حسن کی صورت گری مانا ہے شاعر کا کمال
زندگی میں خود مگر شاعر کی ہے کتنا جمال
جس کے شعروں نے بنایا کیا ہے معراجِ حیات
جُز غم و اندوہ کیا ہے اور اس کی کائنات
میرا حاصل ہم رکابی، ہم کلامی، ہم رہی

(۸)

مانتی ہے جس کو دُنیا بت تراشی کا امام
زندگی بھر جو رہا ہے روز و شب فن کا غلام
اس کا زہرہ شاہکار بت تراشی ہے تو کیا
دخترِ دہقاں کے آگے حُسن اس کا ماند تھا
مطمئن فنکار ہو اس پر بھی اور ہیں شکوہ سنج

وہ جسے حاصل ہے موسیقارِ اعظم کا خطاب
زندگی ہے جس کی رہن بربط و چنگ و رباب
اس کے نغموں کے ستائش گر ہیں یوں بربط نواز
اُس کی ہر دُھن تھی کبھی محفل میں جانِ سوز و ساز
اب خدا جانے نہیں کیوں اس کے نغمے دلگداز
میرا حاصل اس سے بہتر ہے بایں آلام و رنج

(۹)

کاتبِ تقدیر کا ہوتا اگر یہ فیصلہ
میرے دل کی آرزو جو بھی ہو پوری ہو سدا
اپنی یہ تقدیر وجہ یاس و غم ہوتی مجھے!
ماورائے زیست بھی تو کوئی منزل چاہئے
جس کی راہِ بے نشاں میں موت ہو پہلا قدم
زندگی کی آخری منزل بقیدِ زندگی
آخری پروازِ روحانی بجدِ عنصری
جس کا دل چاہے یہ قسمت آزما کر دیکھ لے
لرزہ آتا ہے مگر اس کے تصور سے مجھے
ہے بجز تکمیلِ ہستی اور جنّت کس لئے
در پسِ ایں ہم رکابی وصل و فردوس ارم

(۱۰)

باغِ جنّت کی حقیقت کچھ نہیں اس کے سوا
حسن و صحت ہوں مکمل تا بہ حدِ انتہا
اور ہو پیشِ نظر وہ بحرِ ناپیدا کنار
ہے فقط اک موج جس کی ہستی ناپائیدار
روحِ انساں تا ابد مصروفِ نظّارہ رہے

ہم رکابی گرمیٔ یہ تا ابد باقی رہے
نوجوانی ہو فزوں تر گردشِ ایّام سے
ہو تغیّر زندگانی میں مگر سوئے کمال
اک حیاتِ جاوداں ہو عمر رفتہ کا مآل
ہو یہ سب حاصل تو حاصل ہے بہشتِ لازوال
اور ممکن ہے رہائی قیدِ صبح و شام سے

۱۹۵۵ء

قیصر

ایک لوے سے خطاب

خیر مقدم کر رہا ہوں تیرا، رُوح خوش نصیب چُوم لوں تیرے پروں کو آئے جو میرے قریب!
تجھ کو کہہ دینا پرندہ بے وقوفی کی ہے بات کیوں کہ تو رکھتا ہے وہ جذبات اور وہ حیات
نغمہ ہائے مختلف سے کرتا ہے ظاہر جنھیں آسماں کے پاس سے تو قدرتی انداز میں

اُونچا ہوتا ہے زمیں سے بن کے ابرِ آتشیں اور پھر نیلے فلک پر جاتا ہے اڑ کر کہیں
جب کبھی اڑتا ہے تو گاتا ہے کس انداز سے اور کبھی گاتا ہے تو اڑتا ہے کس انداز سے

ہوتی ہے سورج کے کرنوں کی جو پیدا روشنی جس سے بادل بھی چمک اٹھتے ہیں پا کر خُرمی
دوڑتا پھرتا ہے خوش خوش، دیکھتا ہے کائنات مثل ایسی روح کے جس کا ہو آغازِ حیات

شام کو ہوتی ہے ظاہر جو شفق گوں روشنی وہ چمکتی ہے تری پرواز میں بس خوب ہی
تو ستارے کی طرح دن کے اُجالے میں کہیں اس قدر ہوتا ہے اُونچا گو نظر آتا نہیں
پھر بھی سنتا ہوں بلند آواز تیرے راگ کی جو بھری ہوتی خوشی میں ہے جو دیتی ہے خوشی

وہ بلند اتنی ہیں جتنی ہیں شعاعیں چاند کی   صبح ہوتے ہی نظر آتی نہیں ہیں جو کبھی
وہ نگاہوں سے ہماری ہوتی ہیں گرچہ نہاں   لیکن ہم ان کو بتا سکتے ہیں، وہ ہیں اب یہاں

یہ زمیں اور یہ ہوا کیوں اس سے دل مسرور ہے   سب یہ تیرے نغمۂ آواز سے معمور ہے
جس طرح ہوتا ہے مطلع صاف شب کو جب کبھی   چاند ہلکے ابر سے دیتا ہے اپنی روشنی
اس کی تیزی روشنی کی جھلکیاں برساتی ہے   آسماں ہیں روشنی ہی روشنی ہوجاتی ہے

کون ہے تو کیا ہے تو اور کس سے تو مفہوم ہے   اور مشابہ کس سے ہے ہم کو نہیں معلوم ہے
گرتی ہیں قوس قزح کے بادلوں سے بوندیاں   وہ نہیں کرتیں ہمارے دل کو اتنا شادماں
جتنی خوش کرتی ہے ہم کو تیرے راگوں کی جھڑی   یاد رہتی ہے ہمارے دل میں تیری ہر گھڑی

راگ گاتا ہے، نہیں ہے کچھ ترے راگوں میں فرق   مثل اُس شاعر کے جو روشن خیالوں میں ہے غرق
ہوتی ہے بیدار خوابِ خوش سے جب دنیا تمام   راگ تیرے ہوتے ہیں پھر تو پسندِ خاص و عام
کچھ نہیں کرتا مگر تو اس کی پروا ہے عجب   تو نہیں کچھ کان دھرتا، کرتے ہیں تعریف سب

مثل اُس شہزادی کے ہے تو جو نازک ہے بڑی   قصرِ شاہی کے کسی گوشہ میں تنہا ہے پڑی
ہوگیا صدماتِ اُلفت سے ہے بھرپور اُس کا دل   شیریں اور دلچسپ نغموں سے معمور اس کا دل
اک ادائے خاص سے ہردم ترنم ریز ہے   اُس کا کمرہ نغموں کی آواز سے لبریز ہے

مثل اُس جگنو کے ہے تو جس کا گھر پھولوں میں ہے   رات دن پھولوں میں ہے آٹھوں پہر پھولوں میں ہے
پھر نہیں معلوم ہوتا اس کا وہ روشن لباس   جب چھپاتی ہے نظر سے اس کو شبنم زیرِ گھاس

مثل اس گل کے ہے جو ہے خوشبوؤں کی برج میں　　بند رہتا ہے جو اپنی پتیوں کی برج میں
اُس کی عنبر خیز خوشبو جب چراتی ہے نسیم　　تو قدم آہستہ اُٹھنے دیتی ہے بادِ شمیم

چشمہ سے نکلے ہوئے پانی کے قطروں کی صدا　　جو زیادہ کر رہی ہیں گھاس پر اپنی ضیا
پھول وہ جو بعد بارش کے تر و تازہ ہیں سب　　صاف تازہ خوشنما چیزیں کبھی تھیں لیکن اب
راگ تیرا جو کہ ان چیزوں سے رغبت لے گیا　　اس کو یوں سمجھو کہ اک نعمت ہے جس کو دے خدا

اے پرندے کچھ بتا تو، کچھ تو ظاہر کر خیال　　میں نے عشق اور مے کی گو دیکھی ہے تعریف محال
اس کے سننے والوں سے پوچھو، نہیں ان کو خبر　　بڑھ کے تیرے راگ سے اس میں نہیں کچھ بھی اثر

نغمۂ شادی ترے راگوں کے آگے بدنما　　اور مبارک باد نصرت ایک بھدّی ہے صدا
لائیں گر دن کو مقابل میں ترے تو ہے قصور　　ہوگا یہ معلوم ان میں کچھ خرابی ہے ضرور

چیز ہے کیا تیرے دلکش اور خوش آئند راگ　　ان کا سر چشمہ ہے کیا، اور کس سے ہے ان کا لاگ
کون سے میدان ہیں اور کون سے دریا ہیں وہ　　کون سے جنگل ہیں وہ اور کون سے صحرا ہیں وہ
کون سے ہیں آسماں کے وہ مناظر دل ربا　　اور ہیں وہ کون سے دریا کی موجیں خوش نما
وہ تعجب خیز چیزیں کس زمیں کی ہیں بھلا　　جنس کا اپنے ہی مخفی عشق ہے وہ کون سا
کون سی تکلیف سے ناواقفیت ہے تجھے　　رنج کچھ ظاہر نہیں ہوتا، مسرت سے ترے
تجھ پہ سایا بھی نہیں پاتا، کسی تکلیف کا　　درد و غم کا ذات میں تیرے نہیں بالکل پتا
تو محبّت کرتا ہے اور ہے محبّت کا خمیر　　صاف ہے غمگیں محبّت سے مگر تیرا ضمیر

خواہ تو آرام میں ہو، خواہ بیداری میں ہو　　ہے تجھے معلوم حالِ مرگ پیش آتا ہے جو
خواب میں بھی تو ہمیں آتا نہیں جس کا خیال　　یہ ہمیں معلوم ہے تو جانتا ہے سب کا حال
ورنہ یہ نغموں کی تانیں جو ہیں رنج و غم سے پاک　　کس طرح جاری سدا رہتی نہیں تو ہیں ہلاک

ہم گزشتہ اور آئندہ کا کرتے ہیں خیال　　جو میسر آ نہیں سکتا ہے جو ہے پائمال
اس کے حاصل کرنے کی کوشش میں مخفی ہے زیاں　　سچی سی سچی خوشی میں بھی ہے غم کا کچھ نشاں
بلکہ ہوتے ہیں ہمارے راگ وہ سب سے بھلے　　رنج وہ مضموں ہو جس میں اور ہوں حسرت بھرے

تاہم احساس حقارت اور تکبر بھی نہ ہو　　اور رنج و غم نہ ہو محسوس اپنی جان کو
یہ سمجھ میں آ نہیں سکتا ہے کچھ اس وقت بھی　　ہو سکے گی یا نہیں تیرے برابر کچھ خوشی

اچھے اچھے شعر جو معلوم ہوتے ہیں بھلے　　ان خزانوں سے کتابوں میں ہیں جو اب تک بھرے
اے زمیں کو نفرتوں سے دیکھنے والے لوے　　تیری تانیں اُن سے دیتی ہیں زیادہ کچھ مزے

تو اگر آدھی خوشی بھی مجھ کو کر دے گا عطا　　یا بتا دے گا ذریعہ اس کے حاصل کرنے کا
ایسے دلکش شعر لائے دل سے پھر میری زباں　　محو ہو جائے جسے سُن کر ہر اک پیر و جواں
منتظر رہتا ہوں جیسے میں ترے نغمات کا　　انتظار ایسے ہی سب کو ہو مری ابیات کا

محمدؐ صادق ضیا چنیوٹوی

ابدیت کی کرنیں گہوارۂ طفلی ہیں

عہدِ طفلی ہیں یہ دشت و کوہ اور یہ سبزہ زار
یہ ندی نالے یہ دریا اور رقصاں آبشار
سب لباسِ رُوح ہیں ملفوف آتے تھے نظر
ہو شعاعِ خواب جیسے تابناک و نور بار
وہ تجلی آہ، اب نظروں سے پنہاں ہوگئی
رات ہو یا دن نہیں نورِ حقیقت آشکار

آسماں پر عشرتِ نظارہ ہے قوسِ قزح
پھُول کی رنگینیاں بھی ہیں گلستاں در کنار
دیکھتا ہے چاند بھی سرشار ہو کر کیف سے
آسمان کی وہ فضا جو ہے نہایت خوش گوار
یہ طلوعِ صبح یہ سُورج کی بیداری یہ نور
اور یہ تاروں بھری راتوں میں دریا کا نکھار
میں جہاں جاتا ہوں یہ محسوس ہوتا ہے مجھے
چھن گیا ہے عالمِ ہستی سے روحانی وقار
اب وہ رنگ اس عالمِ منتور کا باقی نہیں
اب افق پر وہ دھندلکا نُور کا باقی نہیں

گونجتے ہیں جب بھرے گلشن میں مُرغانِ چمن
اور جب گلّے میں ہو جاتی ہیں بھیڑیں نغمہ زن
دفعتہً احساسِ غم اپنا بھُلا دیتا ہوں میں
اس سرودِ خوش سے ہو جاتا ہے دل میرا مگن
آبشار اپنا پہاڑی پر بجاتے ہیں رباب
اب نہیں اس فصل میں گنجائشِ رنج و محن

خواب آور کھیتوں سے پھر ہوا آنے لگی ۔۔۔ پھر پسِ کہسار گونجی یہ صدائے غم شکن
آگوالے آمرے چاروں طرف پھر رقص کر ۔۔۔ دیکھ اے ابنِ مسرت ہے جہاں عشرت فگن
جانور سرشارِ موسم ہو کے سب مسرور ہیں ۔۔۔ اپنے نغموں کے اثر کی ڈال دے مجھ پر کرن
سُن چکا ہوں میں بھی ممیانے کی اے بھیڑ وصدا ۔۔۔ اس خوشی میں ہے تمھاری شرکت چرخِ کہن

دل تمھارے ساتھ اس احساس میں سرشار ہے
میری گردن میں تمھاری ہی خوشی کا ہار ہے

نامبارک تھا یہ دن، ہوتی نہ گر مجھ کو خوشی ۔۔۔ یہ فضا اور یہ بہار اور چار سو آسودگی
کر رہے ہیں جمع بچے پھول تازہ ہر طرف ۔۔۔ اور ہے سورج کی کرنوں میں شرارِ زندگی
اک درخت اک کھیت میرے سامنے موجود ہے ۔۔۔ پھول بھی گر کر مرے قدموں پہ کہتا ہے یہی
آہ وہ خوابِ نظر افروز میرا کیا ہوا ۔۔۔ اُف وہ اک معصوم لمحہ نیکیوں کی اک گھڑی

ہے ہماری زندگی خوابِ فراموشِ ازل ۔۔۔ یا ہے اک تارہ جو نکلا تھا ہمارے ساتھ ہی
وہ یہاں آنے سے پہلے ہو اتھا گو غروب ۔۔۔ اور طے کرنے پڑے تھے راستے اس کو کئی
یاد ہیں لیکن اُسے اپنے گذشتہ واقعات ۔۔۔ بھول جانا ان کا ہے دشوار اس کو واقعی
بادل اپنے ساتھ ہم لاتے ہیں کچھ برکات کے ۔۔۔ اور گہوارہ میں اپنے کھیلتی ہے خُلد بھی

رُوح اک دیکھے ہوئے کی یاد میں بیتاب ہے
عالمِ فانی کوئی بھُولا ہوا سا خواب ہے

ایک نوزائیدہ بچہ بڑھ کے ہوتا ہے جواں ۔۔۔ رفتہ رفتہ بھُول جاتا ہے وہ کیفِ جاوداں
اسکی نظروں سے گذرتی ہے خوشی کی ایک شعاع ۔۔۔ سامنے ہوتا ہے مطلع پھوٹتی ہے وہ جہاں
موج کے مشرق سے روزانہ یہ ہوجاتا ہے دُور ۔۔۔ اس جواں کے ساتھ بھی رہتا ہے نور اک ضوفشاں
رفتہ رفتہ ہوتی ہے معدوم بالکل وہ شعاع ۔۔۔ زندگی میں اس کو ہوتا دیکھتا ہے رائیگاں

اپنے فرزندوں کی کرتی ہے نگہداری زمیں   جمع کر دیتی ہے سامانِ محبت بے کراں
مادرانہ مہر سے سوتیلے بچوں کے لئے   اور انسان کے لئے کرتی ہے مہمان داریاں
تاکہ وہ برکاتِ رُوحانی کے قصے بھُول جائے   اور ان محلوں کو بھُولے جلوہ آرا تھا جہاں

خواب سا ہوتا ہے طاری اس طرح انسان پر
بھُول جاتا ہے جو آتا ہے ازل میں دیکھ کر

آہ یہ معصوم بچہ کس قدر طرّار ہے   اپنے گرد و پیش کی خوشیوں سے کیا سرشار ہے
اپنے خود تیار کردہ ہیں کھلونے اس کے پاس   کھیل ہیں ماں اس کے بوسوں سے دخیل کار ہے
باپ کی چشمِ عنایت پڑ رہی ہے بار بار   پاؤں کے پاس ایک نقشہ سا کوئی تیار ہے
ہیں یہ ٹکڑے اُس کے خوابِ زندگی کے منتشر   جس میں اس بچہ کی معلومات کا اظہار ہے
جذب کرتے ہیں اُسے اب ماتم و شادی و غم   اب یہی اک نغمہ اس کے ساز میں بیدار ہے
اب یہ سیکھے گا محبت یا عداوت کی زبان   اس سے پھر برگشتگی فطرت کا اک معیار ہے
دوسرا کردار بھرے گا یہ چھوٹا ایکٹر   جس میں نیکی ہے کہیں پنہاں کہیں پندار ہے

لاتی ہے اسٹیج اس کا ساتھ اپنے زندگی
جس جگہ گویا مسلسل اس کا پیشہ ہے یہی

اے کہ ظاہر میں ترے پنہاں ہے قوتِ روح کی   وقر قائم رکھنے والے بہترین اے فلسفی
اے کہ حاصل ہے تجھے اندھوں سے بالاتر نظر   یہ تری پنبہ بگوشی پھر یہ تیری خامشی
منہمک رہتا ہے تو فطرت کی ہر گہرائی میں   تجھ میں آمد رفت ہے گویا دماغِ قدس کی
اے منجم، اے پیمبر، اور اے فطرت شناس   تجھ پہ روشن ہیں حقائق، تجھ میں ہے وہ روشنی
ہم نے جس کی جستجو میں عمر کر دی اپنی صرف   اور جو تاریکیوں میں قبر کی گم ہو گئی
حیثیت جیسے ہو اک آقا کی ہمراہِ غلام   صبح بن کر تجھ پہ روشن ہے دوامی زندگی
چھوٹے بچے اتنی جو آزادی تجھے روزِ ازل   اس کا حامل تو ہے اب تک میرا ایماں ہے یہی

اپنے مستقبل کی الجھن یاد کیوں کرتا ہے تو
وہ ازل کی برکتیں برباد کیوں کرتا ہے تو

رُوح تیری جلد ہو جائے گی پُر گرد و غبار — زندگانی بوجھ کندھوں پر رکھے گی ناگوار
بار ہو جائیں گے تیری رُوح پر رسم و رواج — کُہر سے تاریک مثلِ زندگی انوار بار
مُحو گو ہم کر چکے ہیں بزمِ رُوحانی فضا — پھر بھی کچھ ہم میں ابھی باقی ہیں پوشیدہ شرار
تجربے بچپن کے فطرت کو ابھی کچھ یاد ہیں — جو گزرنے والے اتنی جلد تھے انجام کار
یادِ طفلی سے ہے پیدا دل میں اک احساسِ شکر — وہ خوشی، وہ واہمہ، آزادیوں کا وہ نکھار
موجزن رہتے تھے یہ جذبے ہمیشہ قلب میں — میں نہیں اُن کے لئے ممنون اور منت گذار
بلکہ ظاہر اور اشیائے شعوری کے لئے — مطلقاً جن کا نہیں حق و حقیقت آشکار

یہ ظواہر ایک دن بالکل فنا ہو جائیں گے
رفتہ رفتہ خود حقیقت آشنا ہو جائیں گے

شکریہ کرتا ہوں اس انسان کی ظنیات کا — ایک نامانوس دُنیا میں جو ہے بھٹکا ہوا
شکریہ دھندلے خیالوں کا ہے جن کے سامنے — مثلِ مجرم کانپتی ہے فطرتِ بزمِ قضا
وہ خیالات اپنی اصلیت میں چاہے کچھ نہ ہوں — ہیں مگر سرچشمہ اک پہلی حیاتِ تازہ کا
وہ حقیقی روشنی وہ قوت و وجہِ قیام — زندگی کی شورشیں جن سے ہوں تسکین آشنا
وہ صداقت جس پہ طاری ہو نہیں سکتا زوال — جس کو بے پروائی اور بکواس سے ہے اعتنا
جس پہ حاوی ہو نہیں سکتا کوئی طفل و جواں — جو خوشی کے دشمنوں سے بھی نہیں ہوتی فنا
ہم پہنچ جائیں سکوں کی رَو میں گو کتنی ہی دُور — یہ سمندر غیر فانی موج میں ہے جلوہ زا
دیکھتے ہیں کھیلتے بچّوں کو ساحل پر مگن — سنتے ہیں آواز اس پانی کی جو ہے موجزن
اے پرندو ہاں خوشی کا راگ پھر چھیڑا ٹھو — بانسری پھر بھیڑ کے بچّوں کو اذنِ رقص دو
کیوں مسرت میں تمھاری ہم نہ ہو جائیں شریک — فصلِ گل کے کیف سے رقصاں ہو تم مسرور ہو

چھن گئی مجھ سے ہمیشہ کے لئے وہ روشنی گھاس اور پھولوں میں شکل اس کا لوٹ آنا ہے گو
حسن کا لمحہ نہ واپس ہو تو اس کا غم نہیں ہے جو باقی ہم جگائیں گے اسی احساس کو
اولیں ہمدردیوں میں جو ہیں قطعاً لازوال اور اِن جذبوں میں پیدا دردِ انساں سے ہیں جو
اس یقیں میں غیر فانی رُوح ہے بعدِ ممات اور یہ اپنا عہد جو ہے فلسفہ کا ہم جلو
پیش گوئی کیوں ہے یہ، ہو گی محبت کو شکست اے پہاڑو، سبزہ زارو جنگلو

میں نہیں غمگین نہ میری حسرتیں مایوس ہیں
دل کی فطرت میں تمہاری قوتیں محسوس ہیں

کھو چکا وہ عیش میں، جو تم سے حاصل تھا مجھے لیکن اب بھی عشرتِ احساس ہے میرے لئے
مجھ کو وہ چشمے پسندیدہ نظر آتے ہیں جو میرے بچپن کی طرح چلتے ہیں جو بل کھاتے ہوئے
طلعتِ معصوم اب بھی صبحِ نو کی ہے عزیز اور وہ بادل جو ہیں سورج کی ضو میں ڈوبتے
ہیں یہ سب اس کے لئے سرمایۂ سنجیدگی درسِ عبرت ہے فنائیت بھی انساں کی جسے
تجربہ میرا نیا ہے نیا انعامِ فکر شکریہ دل کا، ملے ہیں زیست کے جس سے مزے
شکریہ اس کی خوشی ہمدردیوں اور خوف کا میں یہ سب محسوس کرتا ہوں انھیں جذبات سے
بدترین اک پھول بھی ہوتا ہے خلّاقِ خیال اس قدر گہرا تخیّل جس پر انساں رو سکے

بادۂ نو میں خمارِ بادۂ دوشینہ ہے
بزمِ فانی عالمِ ارواح کا آئینہ ہے

ساقی۔ جنوری ۱۹۳۵ء

برق دہلوی

شہیدِ جفا

دامانِ شب تراوشِ شبنم سے تر ہوا
اوجِ فلک پہ ماہِ مبیں جلوہ گر ہوا
زرتار سقف و بام ہوئے کمرہال کے
زریں شعاعِ نور سے اک اک شجر ہوا

زیرِ فلک تھے ساکنِ بزمِ جہاں خموش
ہنگامۂ حیات کا ٹھنڈا ہوا تھا جوش
ہاں اک حسین غم کدۂ کمرہال میں
یوں گرمِ آہ نیم شبی تھی بصد خروش

او سنگ دل ہوا تری الفت کا امتحاں
کس منہ سے تو نے دی تھی وفا کی مجھے زباں
کیا اس لئے ؟ کہ رنج سے گھل گھل کے میں غریب
دوں شرمناک کنجِ اسیری میں اپنی جان

اب کیا ہوا وہ گرمیٔ الفت کا اشتیاق
میں ہوں تری عروس سمن دیدۂ فراق
تیری بلا سے اب میں جیوں یا کہ جان دوں
پلکیں بھی نم نہ ہوں تری گذرے نہ دل پہ شاق

وہ دن بھی کیا تھے رنج سے حاصل تھا جب فراغ
میں تھی پدر کے خانۂ تاریک کا چراغ

تجھ جیسے بے وفا سے پڑا تھا نہ واسطہ　　اندیشۂ فراق سے دل تھا نہ داغ داغ

تاروں کی چھاؤں اُٹھتی تھی نورِ سحر کے ساتھ　　ہنستی ہنساتی خندۂ گل ہائے تر کے ساتھ
رہتی تھی محوِ نغمہ سرائی تمام دن　　میں گلعذار بلبلِ خستہ جگر کے ساتھ

اچھا جو میرا حسن نہ تھا اتنا دل فریب　　جیسی کہ شاہدان محل ہیں گنظر فریب
کیوں تو نے ڈورے ڈال کے پھیلایا دامِ عشق　　پابندِ غم کیا مجھے غارت گر شکیب

کیوں حرفِ آرزو مرے کانوں میں ڈال کے　　دکھلائے سبز باغ فریب جمال کے
میری بہارِ حُسن کو وقفِ خزاں کیا　　گلچینِ عیش دل کی مُرادیں نکال کے

جس دن سے تو نے اپنی نظر سے گرا دیا　　غفلت شعار خاک میں مجھ کو ملا دیا
بے نُور ہیں کنول گلِ رُخسار زرد ہیں　　تو نے بہارِ حُسن کو لُوکا لگا دیا

مری طرح جو ہجر میں گھُل گھُل کے جان دے　　اس طرح جذبِ شوق اگر بے اثر رہے
گھل جائے غم سے حسن مجسم بھی ہو اگر　　طوفاں کی تاب کیا گل نو خیز لا سکے

شاہی محل سُنا ہے کہ ہے جلوہ زارِ حسن　　ہر ناز آفریں ہے وہاں تاجدار حُسن
حورانِ شرق جو کہ ہیں صدر رشک آفتاب　　وہ بھی تو ان کے سامنے ہیں شرمسار حسن

کیوں تو نے حسن کا یہ چمن زار چھوڑ کر　　ہرگز بجائے خود ہے جہاں زینت نظر

مجھ نا شگفتہ پھول پہ ڈالی نگاہِ شوق ‏ میرا جمال ان کے برابر نہ تھا اگر

یوں جلوہ ریز حسن تھا مِرا دیہات میں ‏ تاروں کا نور جیسے ہو تاریک رات میں
قسمت جگاتی کاش کسی ہم وطن کی میں ‏ انمول جانتا جو مجھے کائنات میں

لیکن عجب نہیں یہ مرا خام ہو خیال ‏ شاید نہ ہو کسی کا تو دل دادۂ جمال
ہو کر اسیرِ آرزوئے تاجِ زر نگار ‏ مجھ کو غمِ فراق میں کرتا ہے پائمال

او دشمن وفا! مگر اف کیا گلہ کروں ‏ نخچیرِ غم ہوں کیوں نہ میں گھل گھل کے جان دوں
امید عقد ملکۂ انگلینڈ تھی اگر ‏ تو نے عبث کیئے مرے ارمان غرقِ خوں

تو نے مری ادا پہ کیا دل نثار کیوں ‏ بھر دے کے داغِ ہجر کیا سوگوار کیوں
لے کر بشوق حلقۂ آغوش میں مجھے ‏ تڑپا رہا ہے آہ تغافل شعار کیوں

جاتی ہیں جب ادھر سے حسینانِ خوش خرام ‏ گن گن کے پاؤں دھرتی ہیں کرتی ہوئی سلام
حسرت سے دیکھتی ہیں مِرا ریشمی لباس ‏ کیا جانیں وہ کہ غم سے مِرا کام ہے تمام

وہ سادہ لوح مجھ سے سوا خوش نصیب ہیں ‏ میں آشنائے غم وہ خوشی کے حبیب ہیں
کیا جانیں وہ ہے خندہ وگریہ میں فرق کیا ‏ غم دیدہ بیگمات سے بہتر غریب ہیں

میں سوختہ نصیب ہوں جلنے کے واسطے ‏ گھل گھل کے سوزِ غم سے پگھلنے کے واسطے

شاخِ بریدہ ہوں میں خزاں دیدہ چمن
مری بہارِ حُسن ہے ڈھلنے کے واسطے

ظالم کیا ہے تو نے یہاں تنگ حزیں مجھے
تنہائی کا بھی لُطف میسّر نہیں مجھے
اس غم کدے میں تیری کنیزانِ شوخ چشم
ہر بات پر دکھاتی ہیں چینِ جبیں مجھے

کل شب جو میں ستم زدہ محوِ خرام تھی
آئیں صدائیں کان میں کوسِ رحیل کی
کہنے لگیں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسطرح
بیگم قریب ہے ترے انجام کی گھڑی

اس وقت سب جہان ہم آغوشِ خواب ہے
میں ہوں شبِ فراق ہے اور اضطراب ہے
آنسو بھی آہ پونچھنے والا نہیں کوئی
ہاں اک رفیق شمع بچشم پرآب ہے

رُخصت ہوا قرار کلیجہ ہے پاش پاش
کوسِ رحیل کا ہے وہی شورِ دلخراش
آتی ہے اب یہی در و دیوار سے صدا
بیگم قضا ہے سر پہ کھڑی ہوشیار باش

اس طرح وہ اسیرِ محن گرم آہ تھی
اس غم کدے میں زار بہ حالِ تباہ تھی
لب پر ہجوم نالہ تھا ہر ہر نفس کے ساتھ
سُرخ آنسوؤں کے جوش سے چشم سیاہ تھی

ہونے نہ پایا تھا ابھی دامن سحر کے چاک
ٹوٹا سکوتِ صبح اٹھا شورِ دردناک
آئیں صدائیں، شورشِ ماتم کی غل ہوا
صد حیف محو ہال میں کوئی ہوا ہلاک

آثار سوگ کے نظر آئے اِدھر اُدھر
ماتم میں تین بار بجا موت کا گجر

کر کے طواف غم کدۂ کمسن زہال کا زاغ و زغن نے شور کیا پھڑپھڑائے پر

غل مچ گیا دیہات میں کہرام ہو گیا اُجڑے درختِ سبز غم عام ہو گیا
دم توڑتی تھی قیدِ محن میں جو نازنین آج اس ستم نصیب کا انجام ہو گیا

اب کوئی غم کدہ کے پھٹکتا نہیں ہے پاس بے رونقی سے ہیں در و دیوار تک اُداس
جس روز سے یہ حادثہ جاں گزا ہوا اب تک ہے کمزہال پہ چھایا ہوا ہراس

ہوتے نہیں حسین وہاں محوِ خوابِ ناز ہے اُس جگہ کے سائے سے بھی احتراز اب
اڑتی ہے گرد، جلوۂ گل تھا جہاں کبھی کیا خاک ہو وہاں کوئی نغمہ نواز اب

گریہ کناں ادھر سے گزرتے ہیں رہ نورد اس حادثہ کی یاد سے اٹھتا ہے دل میں درد
پڑتی ہے کمزہال کے برجوں پہ جب نظر بے ساختہ لبوں سے نکلتی ہے آہ سرد

ضامن کنتوری

راہب صحرانشیں

١

دیکھ ادھر اے راہبِ صحرانشینِ نیک خو
رہبری کر، میری اس صحرائے وحشتناک میں
واں جہاں وہ شمع روشن کر رہی ہے دشت کو
جانفزا ہے جس کا نور اس جائے وحشتناک میں

٢

یکہ و تنہا میں رہ گم کردہ پھرتا ہوں تباہ
تھک گیا ہوں اس قدر اب اٹھ نہیں سکتے قدم
پاؤں ایسے شل ہوئے کاٹے نہیں کٹتی یہ راہ
وسعتِ صحرا ترقی پر ہے گویا دم بدم

٣

"دل قوی رکھ اے جواں" بولا وہ مردِ نیک ذات
تاکہ اس آشفتہ خاطر کو ہو ڈھارس اک ذرا
شمع سمجھا ہے جسے تو ہے وہ غولِ بدصفات
تجھکو دھوکا دے رہا ہے تاکہ دے رستہ بھلا

٤

"ہر مسافر اور حاجتمند کی خاطر ہے یاں
میرا دروازہ کھلا اور میرا گھر مہماں سرا
گو سر و سامانِ آرائش مجھے ممکن کہاں
چشم پوشی میہماں سے پر نہیں رکھتا روا

٥

"گر مناسب جان میرے ساتھ کر شب بھر بسر
تجھ کو شاید دے سکے آرام کچھ یہ جھونپڑی
ٹوٹا پھوٹا اک پلنگ اور روکھا پھیکا ماحضر
یہ تھا سامانِ ضیافت اور دعا درویش کی

۶

"دشت میں پھرتے ہیں گو آزاد لاکھوں جانور
پر شکار ان کا کبھی دل سے نہ خوش آیا مجھے
تا بہ امکاں رحم کرتا بے زباں حیوان پر
رحم جو کرتا ہے مجھ پر اس نے سکھلایا مجھے

۷

"قدرتی یہ باغ لیکن جو ہے زیرِ کوہسار
روز مل جاتا ہے یاں سے رزقِ بے منت مجھے
ہیں یہ میوے من و سلویٰ سے زیادہ خوشگوار
اور آبِ صاف ہے چشمہ کا اک نعمت مجھے

۸

"وسوسے دنیا کے ہیں جب تک یہ زحمت ہے ہمیں
اے مسافر دور کر دے دل سے اب فکریں تمام
مختصر ساماں ہے وہ یاں جس کی حاجت ہے ہمیں
اور پھر وہ مختصر بھی چند روز آئے گا کام"

۹

کی مسیحائی وہ اس جادو بھری تقریر نے
جی اٹھا سن کے جسے یہ پا شکستہ بے وطن
خانۂ درویش کا رستہ لیا رہگیر نے
دل ہی دل میں کرتا تھا شکرِ خدائے ذوالمنن

۱۰

دُور آبادی سے کوسوں، بیچ جنگل میں یہاں
تھا بنایا جھونپڑا اک دھوپ پانی کے لیے
دیتا تھا اِن بھولے بھٹکوں کو جو راحت کا نشاں
تھا کمربستہ یہ جن کی میزبانی کے لیے

۱۱

تھا نہ یاں انبار خانہ نے خزانہ تھا کوئی!
حاجب و دربان کی ہوتی جس کی خاطر احتیاج
مثلِ آغوشِ تمنا در کھلا تھا ہر گھڑی
تاکہ آسودہ ہو واں آکر مسافر کا علاج

۱۲

وقت اب وہ ہے کہ فارغ ہو کے اہلِ کاروبار
کوئی سوتا ہے تو کوئی قصہ خوانی میں ہے محو
دیکھنا لیکن ہمارا راہبِ خلّت شعار
اپنے تازہ میہماں کی میہمانی میں ہے محو

۱۳

خشک و تر میوے چنے ہیں سارے دسترخوان پر
جن کے کھانے کے لیے اصرار ہے مہمان سے
حال پرسی ہے کبھی پڑھنا، کبھی اشعار تر
گا ہے کچھ گا تا کہ دل بہلے کسی عنوان سے

۱۴

گرچہ یہ بزمِ مبارک ہے تکلف سے بری
ہر طرف ہے سامنے آنکھوں کے قدرت کا سماں
شمع و پروانہ کی لاگ اور جھینگروں کی راگنی
اک طرف وہ گربۂ مسکین کی خوش فعلیاں

۱۵

یہ مسافر ہے مگر کچھ دل گرفتہ اس قدر
کر نہیں سکتی ہے کوئی چیز اس کا غم غلط
فکر کی کالی گھٹا چھائی ہے ایسی قلب پر
پھوٹ کر رونے لگا آخر کو وہ نیساں نمط

۱۶

دیکھ کر مہماں کو اپنے اس قدر اندوہگیں
فرطِ ہمدردی سے بولا راہبِ فرخندہ فال
"بول کچھ للہ منہ سے اے جواں کیوں ہے غمیں؟
تجھ پہ کیا گزری بنایا تو نے کیوں اپنا یہ حال

۱۷

ناز و نعمت سے ہوئی تھی پرورش شاید تری
اور اب قسمت نے تجھ کو کر دیا غربت نصیب؟
یا کسی سے تو نے دیکھی دوستی میں دشمنی
یا تغافل نے کیا معشوق کے آفت نصیب

۱۸

ہائے وہ خوشیاں مقدر جو دکھاتا ہے ہمیں
ان سے بڑھ کر کون شے ہو گی حقیر و بے ثبات؟
اور اس فانی مسرت میں ہے لطف آتا جنھیں
ہے زیادہ اس سے بھی موہوم ان کی کائنات

۱۹

دوستی دراصل اسمِ بے مسمیٰ کا ہے نام
یا کہ جھوٹی نقل ہے اک دل لبھانے کے لیے
یا وہ سایہ ہے جو ہو ہمراہ دولت کے مدام
چھوڑ دے مفلس کو جو آنسو بہانے کے لیے

۲۰

عشق ہے کچھ اس سے بھی بڑھ چڑھ کے معنی صدا
آج کل کے خوبرویوں کا ہے جو حسنِ مذاق
جس کا دشواری سے ملتا ہے زمانہ میں پتہ
ہاں مگر کچھ فاختہ سے آتی ہے بوئے وفاق

۲۱

"اے گلِ نورستہ کیوں ہے دلگرفتہ غنچہ ساں؟
چھوڑ دے اِن دغا بد خو حسینوں کا خیال"
چونک اٹھا تقریر سن کر اس کا پیارا میہماں
شرم نے دکھلا دیا چہرے کا اصلی خط و خال

۲۲

اب تو ہے پیشِ نظرِ راہب کے کچھ سامان اور
دیکھتا ہے ہو کے حیراں حسنِ تازہ کی بہار
عارضِ رنگین دکھلانے لگے ہیں شان اور
دیکھ کر جس کو شفق بھی ہو سحر کی شرمسار

۲۳

وہ نگاہیں شرم آلود اور سینہ کا ابھار
جوش میں بیتابیٔ دل درپئے افشائے راز
جب اٹھا دھوکہ کا پردہ کھل گیا انجامِ کار
تھی وہ اک دوشیزۂ نازک بدن سرمستِ ناز

۲۴

بولی وہ "کر عفو للہ اس مسافر کا قصور
جو کہ آفت دیدہ ہے بے رہبر و گمراہ ہے
ہوں خجل گھس آئی کیوں ایسی جگہ میں بے شعور
ایک مردِ باخدا کی جو کہ خلوت گاہ ہے

۲۵

رحم کر للہ اس دوشیزہ کی حالت پہ تو
عشق نے جس کو کیا، گمراہ اور صحرا نورد
چشمِ حیرت سے جو ہے جویائے راحت چار سو
پر نہیں جز یاس و نومیدی کسی کو اس کا درد

۲۶

میرے والد تھے رئیس اک صاحبِ مال و منال
جن کی تھی دولت سرا واقع لبِ دریائے ٹین
دوسری اولاد تھی میرے سوا ان کی نہ آل
جس سے رونق گھر کی ہو، آنکھوں کو نور اور دل کو چین

۲۷

جمع رہتے رات دن صدہا جوانانِ حسین
ان کے آغوشِ محبت سے چھڑانے کو مجھے
میرا دم بھرتے تھے سب لیکن خبر اسکی نہ تھی
تھا وہ الفت کی بنا پر یا دکھانے کو مجھے

۲۸

دیکھئے جس کو چلا آتا ہے اک تحفہ لئے
تاکہ جلدی سے ہو اپنی آرزو میں کامیاب
نوجواں تھا اک اڈون بھی ان آنے والوں سے
جس کو تھا اظہارِ الفت سے سدا مانع حجاب

۲۹

تھی نہ قوت حاصل اس کو اور نہ دولت پاس تھی
سادگی تھی وضع میں تھا سادہ دل سادہ مزاج
ہاں مگر اک دولتِ عقل و شرافت پاس تھی
پر یہ دولت ایسی تھی ہے جس کی مجکو احتیاج

۳۰

ساتھ میرے جب نکلتا جاتا تھا گلگشت کو!
اور غزل گاتا تھا کوئی عاشقانہ دردناک
عطر بیز انفاس کرتے تھے معطر دشت کو
اس کا گانا سُن کے گویا مست ہو جاتا تھا تاک

۳۱

کھلتے ہیں کھا کر ہوائے تازہ غنچے ہر سحر
ہے مرصع کار شبنم سے ہوائے گل تمام
پر نہیں ہے کوئی شے پر آب اور پاکیزہ تر
اس کے قلبِ صاف سے لے ہمسری کا جو کہ نام

۳۲

شبنم و گل آج تک ہیں رونقِ باغِ جہاں
سب کو منظورِ نظر جس کا ہو حسنِ بے ثبات
لطف اٹھایا اس نے ان کے حسن کا اور یہ سماں
دائمی اندوہ سے مجکو نہ دے گا اب ثبات

۳۳

کیونکہ پہلے فکر رہتی تھی یہ روز و شب مجھے
جیسے ہو قابو میں اپنے اس کو لانا چاہئے
حال اسکے عشق کا لیکن کھلا جب، تب مجھے
دل لگی سوجھی کہ اس کا دل دکھانا چاہئے

۳۴

کر دیا مایوس جب میرے غرور و ناز نے
جا کے صحرا میں ہوا آخر کو وہ عزلت گزیں
جان دی اس بے کسی میں ہائے اس جانباز نے
چھوڑ کر مجکو غرورِ حسن کا میرے رہیں

۳۵

تھی خطا میری اٹھانے ہوں گے صدمے بھی مجھے
جان دے کر اب بھگتنی ہے مکافاتِ عمل
اُس کا صحرا اسکی عزلت ڈھونڈھنی ہوگی مجھے
آج سوتا ہے جہاں وہ میں بھی واں سوؤں گی کل

۳۶

قبر سے بہتر نہیں کوئی مکاں میرے لیے
اس کے مدفن کے برابر ہوگی میری قبر بھی
یہ تو ظاہر ہے کہ دی اڈون نے جان میرے لیے
حیف ہے دنیا میں بعد اسکے جو میں جیتی رہی

۳۷

اے خداوندا - کیا راہب نے استعجاب سے
اور جھپٹ کر اپنے سینے سے لیا اس کو لگا
اسکی گستاخی پہ آنے کو ہی تھا غصہ اُسے
بول اٹھا اتنے میں راہب جو کہ خود اڈون ہی تھا

۳۸

میری پیاری : انجلینا راحتِ روح وروان
عاشقِ گُم گشتہ تیرا دیکھو یہ موجود ہے
میرے جان ودل کی مالک اڈونِ بے خانماں
مل گیا پھر تجھ سے شکرِ خالقِ معبود ہے

۳۹

اے مری پیاری لگالوں اپنے سینہ سے تجھے
اب تو دل سے دُور ہو رنج وغم روزِ فراق
اب نہیں طاقت جدائی کی بہت صدمے سہے
اے مسیحائے مریضِ عشق کو عہدِ فراق

۴۰

گر خدا چاہے تو اب ہوں گے نہ ہرگز ہم جُدا
ہوگی باقی عمر اخلاق و محبت سے بسر
مہرباں تم ہم پہ ہم ہوتے رہیں تم پر فدا
رنج دیکھے آج تک اب ہوگی راحت سے بسر

دلگداز۔ اگست ۱۸۹۸ء

قاضی عبدالعزیز

عہدِ ہارون رشید

بحرِ ہستی میں تخیّل کی چلی اک دن صبا
بادبانِ زورقِ طفلی ہوا سے بھر گیا
سیلِ دوراں جو کہ مستقبل کی جانب ہے رواں
قوتِ متخیّلہ سے سوئے ماضی ہٹ چلا
دیکھتا کیا ہوں کہ گرما کی ہے صبح نور خیز
سیرِ دجلہ بیٹھ کر کشتی میں، ہوں میں کر رہا
اونچے اونچے ہیں نظر آتے گلستانِ قدیم
ہیں مذہّب اور مرصّع مسجدیں رونق فزا
میں تو ہوں اک صادق و مخلص مسلماں اور ہے
اک پرانے مشرقی کا سایہ نظارہ مرا

زانکہ ایں نظارہ ام بودست از بختِ سعید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

رات ہے اور سر سراتی ہو گئی کشتی رواں
جھک رہی ہیں آبِ صافی پر شگفتہ جھاڑیاں
ساحلِ یم باغ اور بستاں سرا ہیں سر بلند
چشم بر در جن کے دروازے ہیں بہر مہماں
نیلگوں لہروں پہ ہیں سایہ فگن نخلِ ترنج
بادلوں سے ہے سیہ گویا کبودی آسماں
جھلملاتا ہے طلائی ساز و ساماں باغ میں
دھیمی دھیمی جل رہی کافور کی ہیں بتّیاں
دجلہ کے دونوں کناروں پر رکھے ہیں صف بصف
کچھ منقش کوچ، آرامی مبتّت کرسیاں

فی الحقیقت بس مبارک بود ایں وقتِ سعید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

ساحلِ یم سے کہ شادابی میں روشن نام تھا   نہر اک نکلی تھی جس سے شہر شیریں کام تھا
نہر کی جانب بکوشش ناؤ کو میں لے گیا   نخل کا جس کے کنارے پاسبانی کام تھا
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی سبزہ و گلزار پر   نازنینانِ چمن کا خاص جلسہ عام تھا
ہائے وہ دوشیزگانِ باغ کی سرگوشیاں   ہر طرف گلکاریوں نے اک بچھایا دام تھا
سیر کو ان کا لبِ جو اس جگہ آنا جہاں   آبِ دجلہ نے بچھایا بسترِ آرام تھا

بس مکانِ دلپذیر و بس مکانِ پر نوید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

نہر پر تھا آبِ دجلہ کے تموّج کا اثر   یعنی لہریں اٹھ رہی تھیں اسکی سطحِ آب پر
صاف اور شفاف پانی میں کواکب کا تھا عکس   رات بھی سنسان کشتی چل رہی تھی بے خبر
نُور کے چشمے سے آخر بحرِ ظلمت میں گرا   یعنی آیا سایہ اشجار کا تاریک گھر
چند خود رو پھول سوئے آسماں تھے بڑھ رہے   نخل نے اُن کی ترقی روک دی چھت پاٹ کر
نخلِ باسق تھے کنارِ آبِ جو مثلِ ستوں   جنکی شاخیں بن گئی تھیں ان کے گنبد سر بسر

خوش ترین وقتے کہ ایں منظر بدیں ساماں رسید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

بن گئی یہ نہرِ صافی اک مصفّا جھیل تھی   میری کشتی تھی برابر آگے آگے بڑھ رہی
نہر کے سرسبز ساحل سے جو دھاریں تھیں رواں   گرتی تھیں الماس گوں نالوں سے کیسی سُر بھری
صدر کے چشمے سے جو دھاریں تھیں نیچے بہہ رہیں   کرتی تھی جھنکار پیدا جوں ظروفِ نقرئی
چھوٹی چھوٹی پست جو بلّور کی محراب تھیں   اُن سے دھاریں چھٹ رہی تھیں جیسے کرنیں چاند کی
سنگریزے جو چمکتے تھے سفینہ کے تلے   نہر کی لہروں نے کر دی ان میں پیدا کھلبلی

بس مکانِ دلپذیر و بس زمانِ پر نوید
در شبابِ عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

سایہ اشجار میں پیچیدہ رہ اک تھی رواں　　مختلف الوان کی اس پر بچھی تھیں سیپیاں
راستہ کے ہر دو جانب مشک بیز و دل کشا　　مشرقی گلہائے رنگا رنگ تھے چشمک زناں
کچھ صراحی دار گلدانوں میں دیتے تھے بہار　　اور کچھ خوش رنگ گلدستوں میں تھے نکہت فشاں
تھے گلِ رنگیں کھڑے سر کو جھکائے عجز سے　　غنچے تھے خاموش سینے میں لئے رازِ نہاں
بعض تختوں میں کھلے تھے پھول ایسی شان سے　　تاج پہنائے ہوئے تھیں ان کو گویا کلیاں

مشک بار و عنبر افشاں، ہر گل نوشد پدید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

اب تصور نے دکھائی ایسے منظر کی بہار　　جھنڈ لیموں کے جہاں چھائے ہوئے تھے بے شمار
آخر شب رقص تھا شاخوں کا کیا نغمہ خیز　　ان کو مرہم کر رہی تھی نغمہ سنجئ ہزار
راگ بلبل کا نہ تھا، تھی یہ صدا کچھ اور ہی　　دلکش و جاں آفریں تھی، اور نہایت خوش گوار
وہ صدا جادو بھری جس پر ہمہ تن گوش تھے　　عشق سرور، جانِ شیریں، مرگ و شادی اضطرار
جس نے تاریکئ عالم کو مسخر کر لیا　　قیدِ ہستی سے نہ جس کو علتِ دوراں سے کار

ہیں کہ دوراں آرزوئے خود ہمہ در بر کشید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

سرد خانے اور حلو خانے چمن میں تھے کہن　　سایۂ اشجار میں سوتے تھے وہ گویا مگن
نخلِ خرما اور انتظارِ موسم گرما میں تھے　　ان کی صف بستہ ادا سے تھی عیاں شاہی پھبن
دفعتاً اک نور رشکِ مہرِ عالم تاب نے　　اپنے پر تو سے بنایا نور کا بقعہ چمن
جس نے پتوں کے خلا کو روشنی سے بھر دیا　　برگِ کاہی کو بنایا زرِ خالص کا لگن
روشنی پڑتی تھی پتوں میں سے سطحِ آب پر　　نقشِ شب و روز گویا ہو رہا تھا برہمن

عیش و عشرت را نیامد بر زباں ہل من مزید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

سر پہ لے رکھی تھی شب نے چادرِ ہم رنگِ قیر — تھے ستارے، اس میں سلمہ کی طرح واضح منیر
نور کا عالم تھا زیرِ آسماں شاہی محل — ہو رہے انجم تھے جس کو دیکھ کر ظلمت پذیر
لنگرِ سیمینِ کشتی ڈال کر پہنچا تھیں واں — دامنِ ساحل کہ دامن گیر تھا جنّت نظیر
اس قدر آرام و راحت اس گھڑی اس جا عجب — اور یہ دلکش ملایم گھاس سبز و آبگیر

جبّذا دوراں چنیں الوانِ نعمت برگزید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

ساحلِ دریا پہ تھا گلزار اک مہکا ہوا — منظرِ دلکش نے جس نے مجھ کو اپنا کر لیا
منظرِ دلکش تھا یا تھی کشورِ امن و نشاط — تھی جگہ گلگشت کی یا شہر کا طبقہ جدُا
تھیں سطوحِ مرتفع زیبِ چمن اور ہر طرف — سبزہ و سایہ نے بازی فرد کی دی تھی بچھا
تھے چمن میں دیودار و گلبن و نخل و ثمر — گرد ان کے تھے مہکتے دریحاں جانفزا
مشرقی نجم و شجر تھے، تھے منارے سربلند — ان پہ آثارِ زمانہ کا تھا کتبہ کھدرہا

ایں ہمہ اسباب رونق بہر تزئیں شد پدید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

بے خودی تھی مجھ کو گویا خواب تھا میں دیکھتا — ہر روش پر کام تھا زنجیر بندی کا بنا
نور و سایہ چھن رہے تھے اور آتے تھے نظر — قصر و ایوانِ خلیفہ افسرِ عباسیا
عین آنکھوں کے محاذی تھے کھلے ابوابِ قصر — وہ صنوبر کے بنے تھے ان پہ کندہ کام تھا
چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں سنگِ مرمر کی بنی — فرش ان کا تھا منقش، مختلف احجار کا
سیڑھیوں کے متّصل ہی تھے عمودِ زرِ ناب — ساز و ساماں یہ بتاتے تھے زمانہ کی ادا

بر مذاقِ وقت چرخ ایں ساز و ساماں برگزید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

اس قدر ایوان کی روشن تھیں اتنی کھڑکیاں — تاباں سورج تھا گویا اور محل تھا آسماں

ایک شب کی زندگی اور حسرتیں دل میں بہت — اس لیے جلنی تھیں دلسوزی سے لاکھوں بتیاں
اف اے ذوقِ دلبری جو نزع میں بھی رہی — شمع پروانے سے رُخ کرتی رہی اپنا نہاں
بقعۂ نور اس ضیا سے شہر بھر کے تھے محل — تھے فنا ظلمات کو کرتے روپہلی شمعداں
تھے مجلّا گنبدوں پر بسکہ آویزاں ہلال — سقفِ شب پر سیکڑوں قائم تھے اسلامی نشاں

روزگار آں عہد ندرت خیز خوش خوش پرورید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

پر خلیفہ کے حرم میں، میں دبے پاؤں گیا — حسنِ فارس تھا میں اس رویا میں تنہا دیکھتا
اس کی کالی شوخ آنکھوں میں چمک تھی نور کی — دل میں اسرارِ محبت کا خزینہ تھا نہاں
آبنوسی زلفیں موتی سے رخ پر نور پر — کالی کالی رات کی مانند پلکیں مشک سا
زلف تھی پتلی کمر کے گرد بیٹی کی طرح — حسن زیبا میں تھی لاثانی وہ شکل دلربا

آسماں ایں صورتِ رعنا و مہوش آفرید
در شباب عہد صالح شاہ ہارون الرشید

چھ ستونِ نقرئی تھے زینتِ شاہی محل — تین ہر جانب کھڑے تھے خوبصورت بے بدل
ان پہ قائم تھا سریرِ بادشاہِ دادگر — جو مکلّف اور منقّش تھا مطلّا پر خلل
وہ زبرجد یشب سے تھا مرصّع تخت شاہ — جس کے آگے سر جھکاتی تھی زمانے کی دوں
اس سرِ خوشنما پر زیب و زینت بخش تھے — شاہِ عالی مرتبہ اور نائبِ ختم الرسل
چشم زائر میں تبسم کہہ رہا تھا فخر سے — آپ ہی تو ہیں خلیفہ ہادیٔ ملک و ملل

ایں چنیں شانِ خلافت چشم و رقم بدید
در شباب عہدِ صالح شاہ ہارون الرشید

مخزن۔ جولائی ۱۹۰۸ء

ضامن کنتوری

اینک آرڈن

اک سلسلہ ہے پہاڑیوں کا — بہتا ہے جس کے نیچے دریا
ان میں کئی ایک جو درے ہیں — کف سے اور ریت سے بھرے ہیں
آگے اک گھاٹ کی برابر — ہیں سامنے لال لال کچھ گھر
ہے بیچ میں اِک پُرانا گرجا — آثارِ قدیم کا نمونہ
اور آگے جو سڑک بنی ہے — اونچی ہوتی چلی گئی ہے
دیکھو جو ادھر نظر اٹھا کے — گرنی کے بلند ہیں منارے
گرنی کے عقب میں جو سماں ہے — قوّتِ دل و قوّتِ رواں ہے
اونچا سا وہ مرغزارِ دلکش — سبزہ جس کا زمردیں وشش
دکھلاتے ہیں دورِ چرخ کا پھیر — ڈنمارکیوں کے جا بجا ڈھیر
ہے وال جو نشیب خوشنما سا — جیسے کشتی میں ہو کٹورا
ہیزل کے اس میں ہیں گھنے جھنڈ — خوانِ یغما ہے جس سے یہ کنڈ
یعنی کہ بہار جب ہے آتی — لڑکوں کو ہے ساتھ گھیر لاتی
خوش خوش سب چنتے ہیں پھل — جنگل میں مناتے ہیں منگل

سو سال ہوئے کہ اس جگہ پر
ساحل کے کنارے آکے اکثر

کھیلا کرتے تھے تین بچے
گو تینوں کے گھر جدا جدا تھے

اک میں حسین "اینی لی" تھی
تھی رشکِ شباب جس کی طفلی

گو سن تھا بہت صغیر اس کا
بستی میں نہ تھا نظیر اس کا

لڑکا اک دوسرا فلپ تھا
گرنی والے کا تھا جو بیٹا

تھا جان وہ مادر و پدر کی
اک شمع یہی تھی ان کے گھر کی

تھا تیسرا اینک آرڈن نام
ملّاح کا طفل بے سرانجام

طوفان نے بے پدر کیا تھا
بچپن میں یتیم ہو گیا تھا

تینوں شیر و شکر تھے باہم
دنیا کا نہ تھا انہیں کوئی غم

طفلانہ تھا کاروبار ان کا
بس کھیل تھا روزگار ان کا

ساحل کی گری پڑی غنیمت
ان کے حق میں تھی اک دولت

انبار کہیں تھے ریسماں کے
ٹکڑے کہیں ڈھیر بادباں کے

بوسیدہ کہیں سے جال اٹھالائے
کشتی کوئی پانی سے ہٹالائے

ریتی کے محل بنا رہے ہیں
کچھ لطف اسی میں پا رہے ہیں

شورِ امواج دیکھتے ہیں
وہ گھر تاراج دیکھتے ہیں

ہر روز اسی طرح ہیں آتے
اور نقشِ قدم ہیں چھوڑ جاتے

لے جاتی ہے لہر جن کو آکے
تا چشمِ حباب میں جگہ دے

ٹیلے کے نیچے ایک ہے غار
شل دل تنگ تیرہ و تار

تھے کھیلتے آکے یاں وہ اطفال
تھے حال میں اپنے مست و خوشحال

جو جو ہیں امورِ خانہ داری
طے ہوتے تھے یوں وہ باری باری

ہے صاحبِ خانہ گر فلپ آج　　ہوتا اینک کا کل کے دن راج
لیکن بنتی تھی روز اینی　　دونوں کے ساتھ گھر کی بیوی
ایسا بھی گاہے ماہے ہوتا　　اینک کئی روز رہتا تنہا
اتنا جو فلپ تو یہ بہ تکرار　　کہتا مرا گھر ہے یہ، یہ دلدار
دیتا تھا فلپ جواب اس کو　　میری میری بھی ہے یہ خوشخو
تاہم جھگڑا جو پیش آتا　　اینک کہ قوی تھا فتح پاتا
اس وقت فلپ بہ یاس و حسرت　　بھر کر آنکھوں میں اشکِ خجلت
اینک کو بری بھلی سناتا　　کہتا جو جی میں اس کے آتا
صورت یہ دیکھتی جب اینی　　ثالث دونوں میں آپ بنتی
سنگت کے لیے ملال کرتی　　آنکھیں رو رو کے لال کرتی
کہتی نہ لڑو ہماری خاطر　　کرنی ہے مجھے تمہاری خاطر
باہم تم کو نہ لڑنے دوں گی　　بیوی دونوں کی میں بنوں گی

ہر صبحِ بہارِ عہدِ طفلی!　　صبحِ کاذب کی تھی سپیدی
گذرے وہ دن شباب آیا　　بالائے سر آفتاب آیا
آئی جو ہوائے باغِ الفت　　دونوں لگے کھانے داغِ الفت
دل میں چبھے عشق کے جو کانٹے　　بلبل ہوئے دونوں ایک گل کے
موقع اینک نے پا کے ناگاہ　　اس کو کیا حالِ دل سے آگاہ
پر لب پہ جو مہرِ خامشی تھی　　الفت نہ فلپ کی کھلنے پائی
اینک ہی کی اینی کو بھی تھی چاہ　　گو دل کی لگی سے تھی نہ آگاہ
پر شکل ادھر کچھ اور ہی تھی　　اینک کے دل کو لو لگی تھی

تھی فکر اُسی کی، دھیان اُسی کا
تھا خانۂ دل، مکاں اسی کا

دُھن یہ کہ جو بچ سکے بچائے
کشتی ایک اُس سے مول لائے

جب آمدنی کے ہوں کچھ آثار
اپنی کے لیے بنائے گھر دار

تھا نیک خیال اس کا جیسا
آخر ہوا اِرادہ ایسا

ماہی گیروں میں منزلوں تک
آتا تھا نظر نہ مثلِ اینک

تھا ایک ہی وہ میانِ ساحل
خوشحال، جفاکش اور پر دل

اک سال وہ اسکے بھی علاوہ
ملاّح کا کام کرچکا تھا

جس سے خوب اس کو ہوگئی تھی
مشق فنِ جہاز رانی

طوفان میں بھی تین بار اس نے
پائی تھی نجات اجل کے منہ سے

اب چلنے لگا تھا کام اس کا
مشہور تھا سب میں نام اس کا

طے ہو چکی تھی اس طرح بہ مشکل
اکیسویں، عمر کی جو منزل

ذاتی کشتی خرید لایا
چلتے ہوئے کام کو بڑھایا

گرنی کی سڑک پہ گھر بنایا
چھوٹا خوش وضع صاف ستھرا

مقصد کا حصول، دل میں ٹھانا
اپنی کے لیے کیا ٹھکانا

آخر آیا وہ نیک ہنگام
اور موسمِ گل کی جاں فشاں شام

اس گاؤں کے طفل اور جواں جب
تعطیل منانے آئے تھے سب

جھولی لیے کوئی، کوئی ڈالی
پھل چنتے تھے بھر کے ڈالی ڈالی

لیکن تھا فلپ کا باپ بیمار
ساتھ آ نہ سکا وہ سب کے ناچار

آنے میں جو ہوگئی ذرا دیر
قسمت نے دکھایا اور ہی پھیر

آیا دل میں بھرے ہوئے ذوق
ٹیلے پہ چڑھ گیا بصد شوق

نزدیک نشیب کے جو پہنچا | جھاڑی ہے گھنی جہاں، تو دیکھا
اینک اور اپنی دست در دست | بیٹھے ہیں شرابِ عشق سے مست
اینک کا رخ تعب کشیدہ | سر دو گرم زمانہ دیدہ
اور اس کی وہ چشم ہائے میگوں | اندازہ نمائے دشت دہاموں
اک جانِ بہار دلکش عشق | اک شعلہ فروزشِ آتشِ عشق
اُن کے چہروں پہ جو لکھا تھا | اس کی قسمت کا فیصلا تھا
دونوں کو لب بہ لب جو دیکھا | سینے سے اک دھنواں سا اٹھا
آہستہ سے بسملوں کے مانند | دل باختہ بے دلوں کے مانند
جھاڑی میں اتر گیا وہ غمگیں | جی کھول کے زار نالیاں کیں
خوشیاں سب ادھر منا رہے تھے | حرماں جان اس کی کھا رہے تھے
آہستہ اٹھا چلا بمشکل | گھر کی لی راہ داغ ہر دل

اللہ نے پھر یہ دن دکھایا | اینک کا مدعا بر آیا
گرجا میں خوشی خوشی جرس نے | شادی کے بجائے شادیانے
دن کٹنے لگے ہنسی خوشی سے | کس لُطف سے سات سال گذرے
آپس کا خُلوص اور محبت | محنت کی کمائی اور قناعت
مسعود یہ عہدِ ہفت سالہ | یوں صحت و عیش میں گذارا
اولاد بھی حق نے کی کرامت | دختر ہوئی پہلے اک عنایت
بیٹی کی صدائے گریہ جدم | آئی گوشِ پدر میں پیہم
سوچا انجامِ کار مولود | پیدا ہوا یہ خیالِ محمود
جو ہو سکے جس طرح بچائے | تعلیم اچھی اسے دلائے

ماں باپ میں جو کسر ہے باقی — اولاد میں وہ کمی ہو پوری
پورے کئے شمس کے جو دو دور — قوت ہوئی اس خیال کو اور
یعنی اینک تھا جب سفر میں — آغوشِ محیط پر خطر میں
یا یہ کہ رواں میانِ بر تھا — راہ خشکی میں رہ سپر تھا
از بس کہ وہ نقرہ رنگ رہوار — اور رہ آوردِ بحرِ زخار
اس کا وہ لال لال چہرہ — محنت سے سفر کی جو خشن تھا
اینک جو ہر جگہ گزر تھا — پہچانا ہوا تھا ہر بشر کا
بازار ہی تک وہ تھا نہ آتا — تھا دامنِ کوہ میں بھی جاتا
ایک ایک گلی تھی اس کی چھانی — ایک اک ڈیوڑھی تھی اُسکی جانی
ہوتی تھی رسائی اس کی واں پر — ڈیوڑھی وہ قدیم ہے جہاں پر
طاؤس کا در پہ معرکہ ہے — ببر ایک طرف بنا ہوا ہے
اُس کی ہر جمعہ کی غنیمت[1] — واں ہوتی تھی زیبِ خوانِ نعمت
اس حال میں اپنی جب تھی تنہا — بیٹا خالق نے اس کو بخشا
لعلِ شب تاب ہاتھ آیا — تنہائی کا غم گسار پایا

آخر آیا اک انقلاب اور — جیسا کہ ہے اس جہاں کا طور
اُس پورٹ سے پانچ کوس اتر کر — قائم ہوا ایک جدید بندر
پیدل کبھی گہ براہِ دریا — اینک اکثر وہاں تھا جاتا
اک بار وہاں گیا ہوا تھا — مستول جہاز پر چڑھا تھا
تقدیر میں رنج تھا مقدر — مستول سے گر پڑا پھسل کر

---

[1] مچھلیاں مراد ہیں۔

جب ساتھیوں نے اسے اٹھایا   اک پسلی کو شکستہ پایا
یوں گھر میں پڑا تھا جب وہ بیمار   لایا نخلِ مراد پھر بار
پیدا ہوا ایک اور بیٹا   بیمار و نحیف و مضمحل سا
وہ فاقہ کشی و تنگ دستی   اس میں دیا حق نے اور ساجھی
ہر چند کہ تھا وہ مردِ ہشیار   سنجیدہ و حق پرست و دیں دار
پھر بھی دل میں شکوک آئے   ہر سمت سے ابر فکر چھائے
رہنے لگا اس طرح سے بیتاب   جیسے کوئی ہو شب کو بیتاب
تکلیفِ عیال کا الم تھا   پیاری کی مفلسی کا غم تھا
آخر کی یہ دعا خدا سے   محفوظ رکھ ان کو ہر بلا سے
مجھ پر جو گذرتی ہو گذر جائے   لیکن اُن پر نہ کوئی آنچ آئے
کیا جانے وہ کونسی گھڑی تھی   مقبول ہوئی دعا یہ اس کی
مالک جو اس جہاز کا تھا   یہ پہلے جس پہ رہ چکا تھا
ازبسکہ تھا قدردانِ اینک   آیا سوئے مکانِ اینک
دیکھا کہ بُری ہے حالت اسکی   حد سے گذری ہے عسرت اسکی
بولا اینک جہاز میرا   ہے چین کی سمت جانے والا
تاریخ روانگی میں جس کی   مدّت کچھ ہفتوں کی ہے باقی
کرتے ہو اگر قبول خدمت   ملّاح کی ہے مجھے ضرورت
اینک یہ سُن کے ہو گیا شاد   سمجھا اس لطف کو خداداد

دل پر جو گھٹا تھی غم کی چھائی   وہ بارِ مراد نے ہٹائی!
افکار کا اب بھی گو اثر تھا   لیکن وہ صرف اسی قدر تھا

جیسے ہلکا سا کوئی جھالا   سورج پہ ہو جس نے پردہ ڈالا
جس سے دریا کا آبِ شفاف   آتا ہو نظر، کثیف و ناصاف
یوں ہی فکرِ زن اور فرزند   اینک کو نہ ہونے دیتی خورسند
فرقت کا ملالِ جاں گزا تھا   عُسرت کا خیال غم فزا تھا
ڈر تھا کہ یہ فاقوں سے مریں گے   آخر مرے پیچھے کیا کریں گے
لے دیکے تھی صرف ایک کشتی   دل سے اس کو عزیز جو تھی
کرتا تھا وہ اس طرح اسے پیار   ہو عاشقِ اسپ جیسے اسوار
ہرچند اُسے بیچنا ستم تھا   لیکن کچھ اور تھا نہ چارا
ٹھہری یہی رائے آخر کار   کشتی کو بیچ ڈالو ناچار
قیمت جو ملے وہ لے لوا کے   اشیائے تجارتی منگا کے
اس ڈھرّے پہ اینی کو لگا دو   اک چھوٹی سی دکان سجا دو
ہوں جس میں بہم وہ چیزیں ساری   ملّاحوں میں ہو مانگ جن کی
بالفعل یہی ہے شکل اچھی   آئندہ جو ہو خدا کی مرضی
چل نکلی جو یہ دکان داری   آگے تقدیر ہے ہماری
دو چار سفر یونہی کریں گے   دامانِ مراد کو بھریں گے
سرمایہ جو ہوگیا فراہم   خود رہ کے چلائیں گے دکاں ہم
آمد ہو جائیگی جو کافی   آرام سے زندگی کٹے گی
ان بچوں کو خوب دیں گے تعلیم   اچھی ان کی کریں گے تعلیم

آخر اینک بجائے خود جب   طے دل میں یہ باتیں کرچکا سب
آہستہ گھر کی سمت آیا   اینی کو ملول بیٹھا پایا

آغوش میں تھا مریض فرزند جو اُن کا تھا آخری جگر بند
شوہر کی مگر جو دیکھی صورت چہرے پر آگئی بشاشت
خوش ہو کے اٹھی قریب آئی بیٹے کو بھی باپ پاس لائی
مہر پدری سے بوسہ دے کر اینک نے لیا وہ طفلِ لاغر
نازک اُسے ضعف سے جو پایا دستِ شفقت سبک پھرایا
کی انہی سے گفتگوئے الفت آتی تھی جس سے بوئے الفت
حرفِ مطلب مگر چھپایا کہنا چاہا مگر دل بھر آیا
دیتا خبر فراق کیوں کر بات آج کی اس نے ٹالی کل پر
جب صبح ہوئی شگوفہ چھوڑا آخر قفلِ سکوت توڑا

جب[1] سے انگشتری طلائی اینک نے اینی کو پہنائی
پہلا موقع تھا یہ جو اینی اینک کے خلاف منہ سے بولی
شوہر سے لڑے مجال کیا تھی سو طرح سے لیکن التجا کی!
لیتی تھی بلائیں رو کے ہر بار کرتی تھی تر آنسوؤں سے رخسار
یہ دل میں سما گئی تھی اس کے ہوگا نقصان اس سفر سے
کہتی تھی نہ میری آس توڑو ننھے بچے ہیں گھر نہ چھوڑو
میرا نہ کرو خیال پیارے کیا تم کو نہیں یہ لال پیارے
اینک کو مگر یہ دھن سمائی جانے ہی میں گھر کی ہے بھلائی
اینی کی نہ کوئی بات مانی دل سخت کیا، جدائی ٹھانی

---

[1] جب سے اینک اور اینی کی شادی کی قرارداد ہوئی تھی۔

آخر کر دی جدا وہ کشتی — برسوں کی رفیق تھی جو اس کی
جو کچھ ساماں چاہیئے تھا — جلدی سے کیا وہ سب مہیا
کمرہ جو پشت کا تھا باہر — دروازہ جس کا تھا سڑک پر
الماریوں سے اسے سجایا — دوکان کا ٹھاٹھ سب جمایا
کرتا رہا سارا دن یہی کام — اک دم بھی لیا نہ اس نے آرام
آری کبھی لی، کبھی بسولا — یہ ٹھیک کیا اُسے بنایا
اس کام سے روکتا وہ کیا ہاتھ — اینی کا ہے کام جان کے ساتھ
حتیٰ کہ جگہ وہ مختصر سی — آراستہ ہوگئی بخوبی
موزوں جس شے کا جو محل تھا — موقع سے اُسے وہیں پہ رکھا
باغِ فطرت کا جیسے مالی — پھولوں سے سجائے گل کی ڈالی
کھٹ پٹ جو یہ مچ رہی تھی گھر میں — ہوک اُٹھتی تھی اینی کے جگر میں
اینی غم سے ہوئی تھی مبہوت — گویا بنتا تھا اس کا تابوت
سب کاموں سے ہو چکی جو چھٹی — شب آئی وداعِ آخری کی
اینک از بس تھکا ہوا تھا — آرام سے نیند بھر کے سویا

جب صبحِ بلا نے منہ دکھایا — رخصت کا وقت سر پر آیا
بشاش رہا وہ صورتِ گل — مردوں کی طرح کیا تحمل
فرقت کا ملال جو تھا جی میں — وہ ٹال دیا ہنسی ہنسی میں
تھی اس کو نہ اور کوئی بھی فکر — اینی کو ملال ہے یہ تھی فکر
لیکن اس پر بھی پیشِ غفار — مانندِ بہادرانِ دیں دار
شرطِ طاعت بجا وہ لایا — سر کو رہِ عجز میں جھکایا

اس حد میں آگیا کہ ہے واں
"انساں میں خدا، خدا میں انساں"[1]

کی حق سے دعا، کہا، خدایا
جو چاہے وہ ہو حشر میرا

لیکن بچّے یہ اور بی بی
دیتا ہوں اماں میں میں یہ تیری

یارب انہیں بامرام رکھنا
رحمت کی نظر مدام رکھنا

فارغ جب ہو چکا دعا سے
بولا اُس صاحبِ حیا سے...!

اپنی یہ سفر جو اس نے چاہا
ہم سب کے لیے سعید ہوگا

"دیکھو سب ٹھیک ٹھاک رکھنا
گھر کو صاف اور پاک رکھنا

پلٹوں گا میں ایسے وقت پیاری
ہوگی نہ خبر تمہیں بھی جس کی

جھولے کی طرف یہ کہہ کے آیا
آہستہ سے بیٹے کو اٹھایا

بولا کیا دھان پان ہے یہ
کیسی ننھی سی جان ہے یہ

لیکن اسی ضعف کے سبب سے
ہے مجھکو عزیز تر یہ سب سے

اللہ چڑھائے اس کو پروان
پلٹوں گا گھر کو جب میں اُس آن

آغوش میں بیٹھے گا یہ آکے
میں حالِ سفر کہوں گا اس سے

ہر طرح سے خوش اسے کروں گا
ہر ملک کی داستاں کہوں گا

فی الحال تمہیں بھی اور اُسے بھی
دیتا ہوں امان میں خدا کی

پیاری نہ کڑھاؤ اپنا جی اب
رخصت کر دو، ہنسی خوشی جب

ڈھارس کی یہ گفتگو ہوا کی
چپکی وہ غمزدہ سنا کی

دل کو ہر طرح سے سنبھالا
امیدّ پہ غم کو اُس نے ٹالا

لیکن جب اور ذکر آیا
پلٹا پھر گفتگو نے کھایا

---

[1] بائبل میں مذکور ہے کہ حسبِ حیثیت بشریت والوہیت خدا و انسان میں مشترک ہے۔

اینک کرنے لگا نصیحت — جیسی[1] ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا — تسلیم و رضا کا ذکر آیا
خاموش رہی کہا نہیں کچھ — کچھ اس نے سنا، سنا نہیں کچھ
جیسے کوئی گاؤں کی البیلی — بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی
رکھ کر خالی گھڑا تہہِ آب — خود بحرِ خیال میں ہو غرقاب
ہو پیشِ نظر وہ یارِ جانی — جو بھر دیتا تھا اس کو پانی
حتیٰ کہ گھڑا بھرے چھلک جائے — لیکن یہ سنے بھی اور نہ سن پائے

القصہ سن کے ساری گفتار — گویا ہوئی یوں وہ آخر کار
ہشیار ہو اور عقل مند ہو تم — سب سچ ہے بجا ہے جو کہو تم
ایک ہے مجھے مگر یہ کھٹکا — دیکھوں گی نہ میں تمہیں دوبارا

اینک نے کہا اگر یونہی ہے — دیکھوں گا تمہیں مجھے یقیں ہے
اپنی پیاری جہاز میرا — اس روز کرے گا یاں سے پھیرا
ساحل پر آکر دوربین سے — اس دن مجھے دیکھنا کہیں سے
دیکھو تاریخ یہ نہ بھولو — وسواس[2] رہے نہ جس میں جی کو

وہ آخری وقت آخر آیا — منہ جبکہ فراق نے دکھایا
اینک کہنے لگا کہ اپنی — للہ سنبھالو دل کو پیاری

---

[1] لفظی ترجمہ یوں ہوا۔ ملاحوں کی طرزِ گفتگو میں۔

[2] ۔ لفظی ترجمہ یوں ہوا۔ اس وہم پر اپنے آپ ہنسا۔

اپنے جی کو بحال رکھو — بچوں کا بہت خیال رکھو
کیا کیجئے ہے ضرور جانا — لیکن جب تک ہو میرا آنا
ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک رکھو — گھر مثلِ جہاز پاک رکھو
ہونا غمِ ہجر سے نہ مضطر — ہر امر میں ہو نظر خدا پر
لطف و کرم خدائے اکرام — ہے لنگر کشتی دو عالم
کیا اس کا گزر نہیں وہاں پر — ہے جلوہ گر سحر جہاں[1] پر
جاؤں بالفرض میں وہاں تک — اُس سے بھاگوں گا میں کہاں تک
دریا ہے اُسی کا، بحر اُسی کا — ان سب کو اُسی نے ہے بنایا

یہ کہکے وہ نیک مرد اٹھا — پہلو سے مثالِ درد اٹھا
الفت سے گلے میں ہاتھ ڈالا — گرتی ہوئی اینی کو سنبھالا
دہشت زدہ بچوں کو کیا پیار — لیکن سوتا تھا طفلِ بیمار
ماں نے جس دم جگانا چاہا — اینک نے اس کو باز رکھا
سوتے ہی میں کہکے یہ کیا پیار — سونے دو اسے کرو نہ بیدار
بچہ ہے اگر ہوا بھی ہشیار — اس حال سے ہوگا کیا خبردار
تب اینی نے ایک لٹ اسکی کاٹی — دی باپ کو بیٹے کی نشانی
لے کر وہ یادگار اینک — پاس اُس کے رہی جو مرتے دم تک
اٹھا دابا بغل میں بستر — رخصت ہوا، الوداع کہکر

---

[1] مراد:- چین؛ بائبل کے اس فقرہ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر میں صبح کے پر لگاؤں اور سمندر کے انتہائی سرے پر جا کے رہوں تب بھی تیرا ہاتھ میری رہنمائی کرے گا۔

جو دن اینک بتا گیا تھا　　آخر وعدہ کا وہ دن آیا!
اپنی خوش ہو کے مانگ لائی　　جھٹ پٹ اک دوربین کسی کی
لیکن کیا جانے کیا ہوا پھیر　　شاید تھا دوربین کا پھیر
یا اپنی نگاہ کی برابر　　ٹھیک اُس کو نہ کرسکی وہ مُضطر
یا آنکھوں میں دھند چھا گئی تھی　　لغزش ہاتھوں میں آگئی تھی
تھا پیشِ نظر جہاز جب تک　　کرتا رہا گو اشارے اینک
پر اسکی مراد بر نہ آئی　　صورت اس کی نظر نہ آئی

جب تک کہ جہاز سامنے تھا　　پھیرا اپنی نے منہ نہ اصلا
حتیٰ کہ ہوئی نظر سے اوجھل　　وہ لیلیٰ آرزو کی محمل
آخر مایوس ہو کے پلٹی　　اپنی قسمت کو رو کے پلٹی
ہر چند اسے بہت الم تھا　　شوہر کا فراق اک ستم تھا

گو رہتی تھی وہ اداس ہر دم　　تھا حکم کا اس کو پاس ہر دم
قسمت میں جو دکھ تھا بھرتی تھی وہ　　جو اُس نے کہا تھا کرتی تھی وہ
تاہم نہ چلی دکان داری　　اُس کو نہ پھلی دکان داری
اس کام سے آشنا نہ تھی وہ　　آخر زنِ دوستانہ تھی وہ
وہ بنیوں کی چال سے تھی عاری　　اتنی تھی کب اس میں ہوشیاری
آتے تھے نہ بھاؤ تاؤ کے طور　　جو کہتی کچھ اور لیتی کچھ اور
مجبور جو کرتی تھی ضرورت　　رکھتی تھی نہ کچھ خیالِ قیمت
لاگت سے بھی کم یہ مال دیتی　　اونے پونے تھی ٹال دیتی

نقصان پہ ہو رہا تھا نقصان   چلتی نظر آتی تھی نہ دوکان
کھٹکا یہی ہر گھڑی لگا تھا   اینک آیا تو کیا کہے گا
ہر چند نویدِ وصلِ دلدار   پہنچی کبھی کان تک نہ زنہار
موہوم امید تھی یہ جس پہ   جیتی تھی وہ غم کی ماری مضطر
سود اور زیاں سے کچھ نہ تھا کام   پیاروں کا ڈھونڈتی تھی آرام

اب آگے ہے اس طرح سے لکھا   چھوٹا بیٹا مریض جو تھا
ہر طرح کیا علاج اس کا   سنبھلا نہ مگر مزاج اس کا
ہر چند کہ چارہ سازماں تھی   حد بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھی
ہر سانس پہ اسکی دیتی تھی دم   ہٹتی تھی نہ پاس سے کسی دم
الّا گاہک جب آتا کوئی   یا حاجت ہوتی ڈاکٹر کی
لیکن تقدیر اسی طرح تھی   ضائع ہو یہ دوڑ دھوپ ساری
آخر مُرغِ قفس کی صورت   جسمِ خاکی سے ہو کے رخصت
ننّھی معصوم رُوح اس کی   گلزارِ بہشت کو سدھاری

گزرا تھا نہ ایک ہفتہ یکسر   تازہ تھا دل پہ داغِ دِلبر
عشقِ صادق نے گل کھلایا   اینی کا قلب کو دھیان آیا
ہر چند گیا تھا جب سے اینک   دیکھا تھا اُدھر نہ مڑ کے اینک
لیکن اس کا دلِ وفا کیش   رہتا تھا۔ جو اسکی یاد میں ریش
کرنے لگا عرصۂ نفس تنگ   غفلت پہ ہوا ملامت آہنگ
سوچا کہ چلو ذرا خبر لیں   ڈھارس اس بیقرار کو دیں

آیا داخل ہوا مکاں میں ٹھہرا کچھ دیر سائباں میں
پھرتا درِ اندرونی آکر دستک دی در کو کھٹکھٹا کر
پایا نہ جواب کچھ تو آخر کھولا دروازہ آیا اندر
لیکن اپنی بپت کی ماری کھائے ہوئے زخمِ کاری
لختِ دل خاک میں چھپا کر بیٹھی تھی جہاں سے منہ چھپا کر
کیا خوش ہوتی کہ کون آیا دیکھا جو فلپ کو دل بھر آیا
رونے لگی ہوئے رخ بدیوار تر ہو گئے آنسوؤں سے رخسار
یہ دیکھ کے کی فلپ نے منت کہنے لگا از رہِ سماجت
آیا ہوں میں اس لیے کہ آنی مجھ پر کرد ایک مہربانی

کرنے کو تو کی یہ اس نے تقریر پر جب کہنے لگی وہ دل گیر
کیا تم پہ کرے گی مہربانی جو آپ ہے تنگِ زندگانی
کچھ شرمندہ سا ہو گیا وہ لیکن مجبور دل سے تھا وہ
تھی گرچہ حزن خجالت آہنگ شرم اور الفت میں ہو گئی جنگ
ناخواستہ پاس آکے بیٹھا ناخواندہ کیا درِ سخن وا
گویا ہوا اس طرح کہ اینی دو باتیں ہیں صرف مجکو کرنی
تم سے وہی التجا ہے میری اینک کی جو مین آرزو تھی
موقوف نہیں کچھ آج ہی پر تم سے میں نے کہا ہے اکثر
ہم دونوں میں بہترین تھا جو تم نے کیا انتخاب اُس کو
جس بات پر اس نے دل لگایا ہاتھ اُس کا وہیں مدد کو آیا
چاہا کرنا جہاں کوئی کام پہنچا دیا اُس کو تا بہ انجام

اب کیا تھا چھوڑ کے جو گھر بار　　　پردیس کی لی ہے راہِ دشوار
منظور نہ تھا کچھ اس کو حاشا　　　دنیا کا دیکھنا تماشا
زحمت یہ جو اُس نے کی گوارا　　　منشا اس کا یہی تھا سارا
بچوں میں کوئی کسر نہ رہ جائے　　　عمدہ تعلیم ان کو دلوائے
ماں باپ ہیں جس شرف سے محروم　　　اُس سے نہ ہوں نابلد یہ معصوم
لیکن واپس جب آئے گا وہ　　　اس حال میں ان کو پائے گا وہ
ایسی آوارگی کی حالت　　　یہ خود سری اور یہ شرارت
دیکھے گا جب رائیگاں جب انکی　　　یہ صبحِ امیدِ عہدِ طفلی
دل میں کیا اپنے وہ کہے گا　　　کیا کچھ نہ ملال وہ سہے گا
از بسکہ ہے میرا دوست اینک　　　لایا مجھے یہ خیال یاں تک
انکار ہے کیا تمہیں کچھ اس سے　　　کیا ہم نہیں دوست بچپنے کے
پس میری یہ التجا ہے تم سے　　　بچوں کو کرو مرے حوالے
اسکول میں انکو بھیجدوں گا　　　ممنون بہت تمہارا ہوں گا
ہو تم کو اگر خیال یہ کچھ اور　　　اور اسکے لئے بھی اک جدا طور
تعلیم میں ان کی خرچہ جو ہو　　　قرضِ حسنہ تم اس کو سمجھو

اینک واپس جب آئے گھر کو
جو کچھ ہو حساب کرکے دیدو

یہ سُن کے ہوئی خجل وہ ناچار　　　بولی منہ کرکے سوئے دیوار
کیوں کر کروں تم سے چار آنکھیں　　　اٹھتی نہیں شرمسار آنکھیں
کیسی ہوں میں بدنصیب اللہ　　　ملتی نہیں میرے رنج کی تھاہ

داخل ہوئے تم جو گھر کے اندر — میں گڑ گئی بارِ غم سے یکسر
اور اب یہ کلامِ مہربانی — مجھکو کرتے ہیں پانی پانی
لیکن زندہ ابھی ہے اینک — اس میں نہیں میرے دل کو کچھ شک
کردے گا تمہاری وہ ادائی — ممکن ہے ادائی روپئے کی
البتہ یہ بارِ لطف واحساں — اترے سر سے نہیں یہ امکاں

یہ سن کے وہ بولا ہو کے مسرور — اینی کیا تم کو ہو یہ منظور
دیوار سے منہ پھرا کے اینی — اٹھی اس کو قریب لائی
آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے — چہرے کی طرف نظر جمائے
تکتی رہی تھوڑی دیر صورت — پھر دیکے دعائے خیر و برکت
اور ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کے — آہستہ سے تکان دے کے
چھوٹا سا جو گھر میں اک چمن تھا — پکڑے ہوئے ہاتھ لائی اُس جا
طے ہو چکے یوں جو سب مراتب — پلٹا خوش خوش وہ گھر کی جانب
آخر بھائی بہن کو لے کے — بھیجا اسکول میں فلپ نے
درکار کتابیں جس قدر تھیں — ان کی خاطر وہ سب منگا دیں
سمجھا ہر ایک امر میں وہ — فرزندوں کی مثال ان کو
فرض اپنا سمجھ کے ان کا ہر کام — دل سے کرتا رہا سر انجام
پھر بھی اندیشۂ شماتت — اس کی دیتا نہ تھا اجازت
اینی کے گھر کو آئے جائے — دل کی جو مراد تھی بر آئے
بدنامی اینی کا جو ڈر تھا — اس راہ سے بھی نہ تھا گزرتا
ہاں لڑکوں کے ہاتھ سے ہمیشہ — تھا بھیجتا رہتا کوئی تحفہ

جیسے ترکاری اور میوہ — جو باغ میں اسکے پیدا ہوتا
یا کرکے عمدگی کا حیلہ — خیرات کا جس میں ہو نہ شبہ
اعلیٰ درجہ کا صاف آٹا — اکثر گرنی سے بھیجتا تھا

لیکن نہ ہوا خلپ پہ زنہار — مشکوری اپنی کا کچھ اظہار
ہرچند کہ یہ تھا حال اس کا — بندِ ما تھا بال بال اس کا
جوشِ جذبات حق گزاری — دیتا تھا نہ گفتگو کی باری
کرتی تھی ادھر ادھر کی اک بات — آتا اگر وہ پئے ملاقات
جب شکر کا ذکر لب پہ لاتی — گونگے کا سا خواب لب پہ لاتی
بچوں کا تھا پر حال گویا — جو کچھ دنیا میں تھا خلپ تھا
آتے میں جو دیکھ پاتے اس کو — نکڑ سے گلی کے لاتے اس کو
صحبت میں خوش اسکے رہتے تھے وہ — بابا خلپ اس کو کہتے تھے وہ
یہ گھیرتے تھے محبتوں سے — ملتا تھا وہ لاکھ چاہتوں سے
مالک گھر دار کے تھے گویا — ہر شے پہ تھا ان کا حکم چلتا
رستے میں کبھی جو ساتھ جاتے — بک بک کے دماغ اس کا کھاتے
طفلانہ شرارتیں کبھی تھیں — بچپن کی حماقتیں کبھی تھیں
کاندھے پہ کبھی سوار ہوتے — ساتھ اس کے گاہ کھیلتے تھے
دق کرتے تھے بار بار اس کو — لیکن نہ تھا ناگوار اس کو
اینک کے عوض خلپ ملا تھا — نعم البدل اس کا یہ تھا گویا
سچ پوچھو تو یہ زیادہ تھا کچھ — وہ خواب سا ان کو یاد تھا کچھ
جیسے کوئی بڑے سویرے — جھاڑی کے کنارے منھ اندھیرے

تاریکی میں کسی کو دیکھے
سائے کی مثال فاصلے تھے
لیکن اتنا بھی ہو نہ معلوم
کس سمت گئی وہ شکلِ موہوم
دس سال یونہی گزر چکے تھے
اینک کو گئے ہوئے وطن سے
پیدا نہ کہیں سے تھا امر کچھ
اب تک آئی نہ تھی خبر کچھ

اک دن کا ہے ذکر اس طرح پر
اینی کا طفل اور دختر
کرنے لگے ضد یہ اپنی ماں سے
جنگل کو آج سب ہیں جاتے
گر آپ چلیں تو جائیں اماں
ہم بھی پھل چن کے لائیں اماں
پاس خاطر اس کی ان کے ناچار
چلنے کو ہوگئی وہ تیار
پھر چل کے یوں نہ جائیں گے ہم
بابا کو بھی ساتھ لائیں گے ہم
آخر مادر سے اذن پا کے
دوڑے ہوئے گھر فلپ کے آئے
آ کر چاروں طرف جو ڈھونڈا
اس حال سے اسکو مل میں پایا
جس طرح سے کارکن مماکھی
پھولوں کی گرد میں ہے رہتی
مقصد سے کیا یہ کہکے آگاہ
بابا فلپ آؤ تم بھی ہمراہ
پہلے اس نے کیا کچھ انکار
دامن سے لپٹ گئے وہ دلدار
مچلے کبھی، گاہ خوشامدیں کیں
قسمیں کبھی دیں، کبھی ضدیں کیں
اس بچپنے پر بہت ہنسا وہ
راضی چلنے پر ہوگیا وہ
اینی تھی جو ساتھ جانے والی
بچوں کی نہ بات اس نے ٹالی

مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

کبیر کوثر

شکستِ باطل

(۱)

قصرِ خوابیدہ کا ماحول

بدلتے ہوئے روز و شب کے کرم نے
ہلوں اور ہنیوں کے حُسنِ ستم نے
ہرے زرد کھیتوں سے دھرتی سجادی
دھنک کے رنگوں میں حرارت بسادی

(۲)

صحنِ گلستاں

مگر قصرِ شہ پر فسوں چھا چکا ہے
در و بام پر سحر لہرا چکا ہے
جہاں غنچہ و گل میں رس جم چُکا ہے
رگِ زندگی میں لہو تھم چُکا ہے

حجر اور شجر کے ہوئے ماند سائے

فضاؤں میں جیسے دھواں تھم سا جائے

جو کھیتوں میں کچھ گوپیاں گا رہی ہیں

صدائیں یہاں تک وہ یوں آ رہی ہیں

کہ جیسے ندا گونج کر چھو رہی ہو

شکم میں کسی ماں کے دُرِّ صدف کو

(۳)

یہ ڈھلواں زمینیں، یہ سرسبز میداں

طلسم مکمل ہے جن کا نگہبان

خیاباں کی شفّاف جھیلوں کا پانی

نمودِ تموّج ہوا جس میں فانی

دُرِ آبِ زر کا یہ روشن فوارا

اُڑا تھا جہاں سے وہیں لوٹ آیا

کیاری میں طاؤس ساکت ہے بیٹھا

سنہرے قفس میں ہے خاموش توتا

مناروں پہ جو اڑ رہا تھا وہ پرچم

خمارِ فسوں سے کبھی کا ہوا خم

خموشی سے لیٹی ہیں بے جان روحیں

نہائی ہوئی نرم سی روشنی میں

(۴۳)

ایوانِ شاہی

ہیں ایواں میں قصرِ شہ ذی اثر کے
سُلگتی انگیٹھی ہیں بے جان شُعلے
چھتوں سے برابر جو ٹکرا رہی تھی
ابابیل بیٹھی ہے وہ پر سمیٹی
جو انڈے ہیں نیچے انھیں سے رہی ہے
مگر ان میں شمعِ بقا سو گئی ہے
ہے پوشیدہ کھونٹی حریری قبائیں
مگر سرسراہٹ نہیں کچھ ہوا میں
پتنگے بھی موجود بے شک خلا میں
مگر بھنبھناہٹ نہیں کچھ فضا میں
مشابہ ہے ہر شے زیادہ بتوں سے
سلاطینِ رفتہ کے اُن فوٹوؤں سے
جو تکتے ہیں کھوئی ہوئی ہستیوں کو
شبستاں میں سوئی ہوئی مستیوں کو

(۵)

باورچی خانہ

دباتی ہے ساقی نے گھٹنوں میں بوتل
مشام مئے سے پپوٹے ہیں بوجھل

ٹھٹھکا رہ گیا منُہ رم کاغذوں پر
قلم تھک کے رُک ہی گیا دائروں پر

کنیزہ کا اک ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر
کوئی گیت جیسے سُناتا ہو نوکر

لبِ نیم وا پر ہے اُس کے فراواں
طلب لمس کی اور بوسوں کا اِمکاں

اُسی خادمہ کے لبِ لعل افشاں
ہزاروں فسانے سُنانے کے خواہاں

مگر اس کے عارض حیا جیسے مانگیں
دھنک کے رنگوں سے حنا جیسے مانگیں

(۶)

دربار

خزاں کے نہ گزریں گے سو سال جب تک
منُہ زر ہے گا یہ ماحول تب تک

مہ و مہر انور کی جو برچھیاں ہیں
انہی کے لئے نیم وا کھڑکیاں ہیں

دریچوں سے چھنتی ہیں یوں بھی شعاعیں
کہ بلّوری شیشے شفق میں نہائیں
ہیں سوئے مدعوّین سارے کے سارے
حصارِ طلسمی کے مارے بچارے
جمع دائرے میں ہیں سنجیدہ چہرے
امیر و شجیع مضطرب سے ہیں بیٹھے
وجاہت ہے چہرے پہ جس کے فراواں
یقیناً ہے کوئی وہ باظرف سلطاں
لبالب ہے مینا مئے ارغواں سے
اجازت ملے کاش پیرِ مغاں سے

(۷)

یہ عمارت کے چاروں طرف جھاڑیاں ہیں
ہرے خشک پتّوں کی کچھ برچھیاں ہیں
جو تنہا مسافر کو کچھ فاصلے سے
دکھائی پڑیں قافلے جنگلوں کے
شجر اور بیلیں، ببول اور کانٹے
کنارِ افق پر ہیں ریشم کے بُوٹے
چھپاتے ہیں انگور کے سبز گچھے
مئے سُرخ سے ہیں شرابور گچھّے
شجر جھاڑیاں اور بیلوں کے پتّے
گتھے ہیں وہ آپس میں کچھ اس طرح سے

کہ جیسے کوئی سبز چادر تنی ہے

کسی سادہ رُخ کا دوپٹہ بنی ہے

یہ احساس دیتی ہے اُن کی بُلندی

کہ اوجِ محل اُن کے آگے ہے پستی

انہی کی بلندی کا اُونچا ستارا

نشیبوں میں لایا محل کا منارا

(۸)

احساسِ فردا

نہ جانے یہ سو سال کب ختم ہوں گے؟

بہیں گے نئے کب خیالوں کے دھارے

جنم لے نیا علم کب کون جانے؟

نئی سوت پائے نئے کب دہانے؟

نئی روح گائے کچھ ایسے ترانے

جو انساں کی روحوں کو سچائی دیدے

جمُودِ خرد کو فسوں سے جگا دے

نئے وقت کے کچھ تقاضے چُکا دے

دماغوں کو عرفاں کی دولت سے بھر دے

ذہینوں کو پالیں کچھ ایسی نظر دے

ہر اک چیز جامد ہے زورِ فسوں سے

کہ جیسے ہو تابع فرماں کسی کے

رجا و اُداسی، سرورِ مشقّت
لیے ساتھ اپنے چلی آتے قسمت

خوشا جلد آئے وہ بخت سکندر
ہے وابستہ جس سے شکستِ فسوں گر

(۹)

حُسنِ خفتہ

ہے تنہا شبستاں میں آرام فرما
نگارِ بہاراں کہ نُورِ تجلاّ

وہ برسوں سے صوفے پہ لیٹی ہوئی ہے
قیامت خموشی سے سوئی ہوئی ہے

سُنہرے، سجیلے حسین گلبدن کو
بہاروں میں لپٹے ہوئے اس چمن کو

چھُپائے ہوئے ہے سنہری دُشالا
عیاں ہے مگر صاف ہیروں کی مالا

چمکتے ہیں رُخسار نُورِ گہر سے
اندھیرے پریشاں وجودِ قمر سے

اُسی حسنِ خفتہ کو دونوں طرف سے
سیاہ فام ناگن سی کوئی ہے گھیرے

وہ زُلفِ دُتا بڑھ گئی دونوں جانب
مگر اس پہ انوارِ عارض ہے غالب

جو ہیروں کی مالا سے شعلے اڑے ہیں
گھنیری سیاہ زُلف پر جم گئے ہیں

(۱۰)

ہے نیندوں میں کھویا وہ حُسنِ مجسّم
تنفّس میں لیکن نہیں ہے ترنّم

لحافِ حریری پہ تارے مزیّن
فروزاں ہوا جن سے حُسنِ مُعیّن

سنہرے کناروں کا تکیہ سرہانے
کہیں سے ہے اُبھرا کہیں پر دبا ہے

جڑاؤ مُرصّع کلائی میں کنگن
طِلائی زُمرد کے بازو پہ جوشن

دَمکتے ہیں بازو ضیائے گہر سے
صباحت فروزاں طلوعِ سحر سے

جمالِ مجسم سے ماحول روشن
بہاروں میں ڈوبا ہوا جیسے گلشن

نگارِ سحر میں اضافے کا باعث
عُروبِ قمر تک اُجالوں کا وارث

جو قلب و جگر پر ہے بکھری ہوئی سی
وہ مہکی ہوئی زلف جنبش سے عاری

(۱۱)

فسوں شکن

تلاشِ صداقت میں گھر سے جو نکلے
لبِ کامرانی انھوں نے ہی چُومے

محبّت اسی طرح دو ساتھیوں کو
بتاتی ہے اُن کی نہاں خوبیوں کو

کہ رہیں جو بے چین سی ہوں ازل سے
ملیں گی کبھی جیسے لہریں کنول سے

چلا آرہا ہے وہ رشکِ سکندر
امیدوں کی دنیا لئے دل کے اندر

بیاباں کے سینے کو وہ چیرتا ہے
چٹانوں پہ جیسے ہرن دوڑتا ہے

(۱۲)

شکستِ فسوں کے جو کل تک تھے خواہاں
وہ مُردہ پڑے ہیں بیاباں میں بے جاں

انھیں دیکھتے ہی وہ یوں مُسکرایا
صدف سے گہر بن کے نکلا ہو قطرا

یہ بولا، سما کر وہ نظروں میں ڈھلنچے
یہ جہد و طلب میں شہید ہو گئے تھے

یہ اک ذہن میں تھی کہاوت پرانی
ہزاروں میں اک کو ملے کامرانی

(۱۳)

نہیں اس کو معلوم منزل کہاں ہے
جبیں سے مگر عزم راسخ عیاں ہے

گزشتہ زمانے میں غیبی ندا نے
سفر کے زمانے میں کانوں میں اُسکے

مسلسل رہِ شوق کی رہبری کی
برابر اسی سمت کی رہنمائی

یقینوں سے بھرپور سرگوشیاں کیں
سُطورِ کہن کو نئی سرخیاں دیں

یہ آواز تھی اس کے سازِ جنوں کی
یقیناً تجھے قیمتی شے ملے گی

(۱۴)

آمد

وہ جب جھوم کر خارزاروں سے نکلا
خزاں کا جنازہ بہاروں سے نکلا

خوشی کے انار اس کے گالوں پہ چھوٹے
فلک پر شفق کی انگیٹھی سی دہکے

جبیں سے پسینے کے پکھراج ٹپکے
سرِ شام جگنو درختوں پہ چمکے

نجانے اسے غیب نے کیا مدادی
دبی جس نے سینے کی دھڑکن بڑھا دی

قدم سوئے منزل جب اس نے بڑھائے
چراغِ سرِ راہ خود جگمگائے

(۱۵)

دیدار

محل کے وہ صحنِ گلستاں میں آیا
بہت دور چل کر شبستاں میں آیا

دبے پاؤں اس رُخ شبستاں کے پہنچا
جہاں حسنِ خفتہ تھا آرام فرما

چکوری کے مانند دل اس کا دھڑکا
دماغ اس کا قربِ تجلی سے مہکا

وہ بحرِ تخیّل میں پھر بہہ گیا کچھ
نشاط و طرب میں وہ یوں کہہ گیا کچھ

مری جاں گھنیری یہ زلفیں تمہاری
ہیں جو اتنی شب رنگ اور اتنی پیاری

تو آنکھیں جو پلکوں میں پردہ نشیں ہیں
خدا جانے کتنی سیاہ اور حسیں ہیں

ہجومِ تمنّا سے گھبرا گیا وہ
مئے وصل پیتے ہی لہرا گیا وہ

(۱۶)

لبِ لعل سے اُس نے بوسہ چرایا
کسی شوخ مصرع پہ مصرع لگایا

وہ اِک لمس جس نے فسوں توڑ ڈالا
طلسمی سمندر کا رخ موڑ ڈالا

ہر اک شخص چھوٹا بڑا جاگ اُٹّھا
جمودِ تجسّم میں ہیجان پھیلا

قدم جھُوم اٹھے نظر جھوم اُٹھی
دریچوں کے کھُلنے کی آواز آئی

بڑے زور سے مرغ کی بانگ آئی
جو پھوٹی کرن تو فضا جگمگائی

چمن میں نسیمِ سحر لہلہاتی
محل کے در و بام میں جان آئی

خروشِ سحر نے نئے گیت گائے
شبستاں نے انگڑائی کو ہاتھ اٹھائے

صدائے طرب سے وہ ایوان گونجا
جہاں پر شہنشاہ سویا ہوا تھا

دُرِ آبِ زر کا وہ روشن فوارا
جو ساکت تھا اِک دم بلندی پہ پہنچا

محل کے کنارے جو کچھ جھاڑیاں تھیں
فسوں ٹوٹتے ہی وہ یکدم نہاں تھیں

بلندی پہ جا کر اڑا پھر وہ پرچم
خمارِ فسوں سے پڑا تھا جو پُرخم

بصد شوق ساقی نے بوتل اٹھالی
مئے ناب کی لب پہ سُرخی لگا لی

اُٹھا منصرم اور لکھنے لگا پھر
قلم کاغذوں پر پھسلنے لگا پھر

انگیٹھی کے شعلوں میں آنے لگا دم
دہکنے لگے سُرخ شعلوں کے پرچم

حریری قبا سرسرائی فضا میں
پتنگوں نے پرواز کی پھر خلا میں

ابابیل چکّر لگانے لگی پھر
نئی رُوح انڈوں میں آنے لگی پھر

کیاری میں طاؤس پھر چیخ اٹھا
سنہرے قفس میں جو توتا تھا چہکا

اُلجھنے لگا پھر کنیزہ سے خادم
دلوں میں مچلنے لگا عشق ظالم

رگِ زندگی نے تڑپ کر اچانک
سکوتِ محل کو جھنجھوڑا یکا یک۔

سکوں خیز دامن سے جیون کے سوتے
زمیں کا جگر توڑ کر پھوٹ نکلے

جمودِ مُسلسل کے چہرے اُڑے ہیں
حیات و جہد کے فوارے اُڑے ہیں

(۱۷)

ایوانِ سُلطان

مگر سب سے آخر وہ سُلطان جاگا
جو ملتے ہوئے اپنے گالوں کو بولا

قسم ہے صلیبِ مقدّس کی یارو
مِرے رُخ پہ داڑھی ہے کیوں کر بتا دو؟

امیرو ابھی یہ کہا تھا کسی نے
کہ بس ہم ذرا دیر کو سو گئے تھے

اگر ہے حقیقت تو پھر شاہی داڑھی
یہ کیوں گود میں آگئی ہے ہماری

بہ آوازِ یک یہ سبھی بول اٹھے
کہ چھپکی کی سی لی بعد کھانے کے ہم نے

خدا کی قسم کھا کے سلطان بولا
کہ سختی سے جکڑے ہوئے ہیں یہ اعضا

بہر نو یہ بل پاس کردیں بتاؤ
رکھا تھا ابھی نصف گھنٹہ ہوا جو

مگر چانسلر، جو نگوں سر تھا بیٹھا
ادب سے وہ دربارِ شاہی میں اٹھا

وہ زنجیرِ زر کو مروڑا کیا پھر
علیحدہ تبسم سے بل رکھ دیا پھر

(۱۸)

رُخصت

اٹھی پھر وہ صوفے سے انگڑائی لیکر
بہارِ مجسّم، شعاعِ منور

جھکی بازوؤں پر وہ جادو شکن کے
چلی ساتھ اس کے نکل کر محل سے

پہاڑوں کے کچھ قرمزی دائروں میں
گزرتے ہوئے دن کی گہرائیوں میں

وہ چلتے ہوئے کہساروں سے گذری
نئی ایک دنیا کی سو، ہے جو بوڑھی

بنی ہم سفر اپنے منظورِ دل کی
ازل سے ہی جس کی رفیق وجگر تھی

گذرتی ہوئی شوق کی رہ گذر سے
مخاطب ہوئی یوں رفیقِ سفر سے

مری جاں یہ سچ ہے صدی ایک گذری
بہر کیف منزل کہاں ہے ہماری
شہد اس کے کانوں میں گھولا کسی نے
خُمارِ طرب سے کہا یہ اسی نے
مری جان و دل ساتھ میرے چلی آ
مری تو ہی منزل مرا تو ہی جاوا

وہ دربارِ اعظم ہماری ہے منزل
جہاں معجزوں کی سنورتی ہے محفل
چلے سمتِ منزل حسیں قافلے سے
پہاڑوں کے پھر قرمزی دائرے سے
اُجالوں میں شمس و قمر چل رہے تھے
طلوعِ شفق سے دیئے جل رہے تھے

جولائی ۱۹۶۳ء

سید راحت حسین

قریۂ ویراں

۱

بستی کی خُوش حالیاں

اومری او برٹن[1] دلکش تھی ہر اک تیری ادا — وسط صوبہ میں، تو اک بستی تھی پیاری دلربا
ہر طرح کی تھی کسانوں کو ترے آسودگی — چین سے خوش خوش بسر کرتے تھے، اپنی زندگی
وقت سے پہلے، بہار آتی تھی تجھ میں خندہ رو — بعدِ موسم، فصلِ گل رہتی تھی باقی، چار سو
وہ گھنیری چھاؤں، تیرے کنج وہ راحت رساں — رو رستاتے تھے آکر جس جگہ طفل و جواں
تھا کبھی ایامِ طفلی میں، مرا اس جا مقام — مجھ کو آتی تھی ہنسی، ہر کھیل پر جب صبح و شام
سبزہ زاروں میں ترے ٹہلا کیا ہوں بار بار — وہ کسانوں کی مسرت، سادگی کی وہ ادا
بار ہا ایک ایک منظر دیکھ کر، تڑپا ہوں میں — رک گیا ہوں چلتے چلتے، چل کے پھر ٹھٹکا ہوں میں
جھونپڑے محفوظ تیرے وہ زمیں چلتی ہوئی — وہ تری ندی رواں، چکّی تری چلتی ہوئی
وہ عبادت گاہ تیری اک پہاڑی پر بنی — جس کی پاکیزہ عمارت، تمکنت سے تھی کھڑی

---

[1] قریہ بسانے کا فرضی نام جہاں شاعر کا زمانۂ طفولیت گزرا تھا۔

سرخ دلکش جھاڑیاں، وہ کونپلیں انکی ہری
بیٹھکیں سایہ میں جن کے جابجا پر تھیں . بنی

باتیں کرنے کو وہاں آتے تھے بڈھے صبح و شام
اور جواں، اپنا نظربازی سے کر جاتے تھے کام

اے خوشا وہ آنے والے دن تری تعطیل کے
بازیوں کے دور کی، جب دھوم ہوتی خیر سے

شوق میں جس کے رہا کرتا تھا محو انتظار
اور ایک ایک دن گنا کرتا تھا ہو کر بے قرار

تھے ترے اشجارِ عالی شاں جہاں سایہ فگن
پاکے فرصت، جوق جوق آتے تھے دہقاں خندہ زن

کھیل جم جاتا تھا، سایہ میں درختوں کے ترے
دل بڑھاتے تھے تماشائی قرینے سے ترے

نام پر جانیں لڑا دیتے تھے اپنی نوجواں
ان کا عالم دیکھتے تھے سن رسیدہ نوجواں

غول باندھے کھیل دوڑے کا دکھاتا تھا کوئی
جست کرتا، دوڑ کر کوئی اچھل جاتا کوئی

کشتیاں لڑتے اکھاڑوں میں اتر کر پہلواں
اور نئے کرتب دکھاتے تھے بہادر نوجواں

رنگ لاکر، ہاتھ کی پھرتی دکھاتا تھا کوئی
شعبدہ بازی کوئی کرتا کوئی جادوگری!

الغرض اس وقت تک یہ بازیاں ہوتیں یونہی
تھک کے جب جنگل پکار اٹھتا نہیں بس اب نہیں

دور بازی کا بدلتا، کھیل ہوتا پھر نیا
پھر نئی دلچسپیاں ہوتیں، تماشا پھر نیا

ناچنے والوں کے جوڑے پھر نکلتے خیر سے
کد یہ ہوتی، کون جیتے، کون تھک کر گر پڑے

روپ بھر کر، سوانگ لاتا تھا جو کوئی مسخرا
بے خبر دہقاں کا منہ، ہوتا تھا کالک سے بھرا

گدگدی سی دل میں ہوتی، مسکراتے خاص و عام
چپ کے چپ کے کھلکھلا کر لوگ ہنس پڑتے تمام

و جب کنواری لڑکیاں شرم و حیا سے دیکھ کر
ڈالتیں ناز و ادا سے، پیار کی ترچھی نظر

بیبیاں بیاہی ہوئی آنکھیں دکھاتی تھیں انھیں
تھا یہ مطلب یوں نہ وہ ہرگز نظربازی کریں

تھیں یہ تجھ میں خوبیاں، او پیاری بستی دلربا
کھیل تفریح و تماشا، بازیاں لاانتہا

وہ نشاط افزا تماشے، دل ربا وہ بازیاں
جن سے ہو جاتی تھیں آساں، محنتوں کی سختیاں

کھیل کا دلکش اثر پڑتا تھا ہر سو بار بار
تیری ہر شے میں، نظر آتی تھی اک تازہ بہار

خوبیاں تجھ میں جو تھیں معدوم ہو کر کھو گئیں
ہائے وہ دلچسپیاں اب ہیں کہاں؟ کیا ہو گئیں؟

۲

اُس کا برباد اور ویران ہونا

پیاری بستی! خندہ رو تھا تیرا حُسن دیدہ زیب — بافضا میداں میں تھی تو کتنی پیاری دلفریب
کھیل تفریح و تماشہ کر گئے یکسر فرار — خوبیاں سب مٹ گئیں، جاتی رہی تیری بہار
رُوح افزا چھاؤں تھی تیرے درختوں کی جہاں — اب وہاں ظالم نظر آتا ہے تجھ پر حکمراں
درد کی تصویر ہے، اجڑا ہوا تیرا دیار — ہائے کیا سنسان نظر آتے ہیں پیارے سبزہ زار
صرف تنہا ایک مالک ہے ریاست کا تری — حال ابتر ہو گیا کیسا زراعت کا تری
کاشت تیری رفتہ رفتہ آہ آدھی ہو گئی — تیرے سبزہ زار کا حسنِ تبسم کھو گئی
مثلِ آئینہ کہاں اب تیری ندی موجزن — جسکے پانی میں، جھلک جاتی تھی سورج کی کرن
گھٹ گیا دم اُس کا، اُگ آتی ہیں نے کی جھاڑیاں — تیز رفتاری کہاں، رک رک کے پانی ہے رواں
وادیوں میں تیرے ٹراک رہ گیا ہے میہماں — آشیانے کی نگہبانی میں سرگرمِ فغاں
نغمہ سنج و خوش نوا اب کون مہمانوں میں ہے — مُرغِ صحرائی خراماں تیرے ویرانوں میں ہے
نالہ زن تیری تباہی پر ہے یوں وہ سوگوار — تھک گئی ہے گونج، ویرانے میں رٹ کر بار بار
گھر جو سائے میں درختوں کے بنے تھے بافضا — ہو گئے وہ ڈھیر، اک تودہ ہے مٹی کا پڑا
رنگ لائی ہیں، وہ دیواریں تری ڈھائی ہوئی — لمبی لمبی لہلہاتی گھاس ہے آئی ہوئی
خوف سے غارتگروں کے تھی یہ شوریدہ سری — تیرے بچوں کے دلوں میں پڑ گئی تھی تھرتھری
آہ کس جور و ستم سے وہ جُدا تجھ سے ہوئے — دل گرفتہ جاتے جاتے، کالے کوسوں جا پڑے

۳

دولت کی ترقی اور قوم کی تنزلی ملک کے ادبار کی نشانی ہے۔

مبتلا ہے وہ ملک جس میں فزوں ہو مال و زر — اور قوم اُس کی فنا ہوتی ہوئی آتے نظر

والیانِ ملک یا نوّاب ہوں ذی مرتبا — ہے مساوی قوم میں اُن کی بقا ہو یا فنا
دم میں بنتی یا بگڑتی ہے یہ مخلوقِ جہاں — حکم شاہی، اسکی ہستی کا ہے اک رازِ نہاں
ہاں کسانوں کی بہادر قوم ہے اک بے مثال — ہوگئی جب وہ فنا، بھرتی ہے پھر اس کی محال

۴

کسانوں کی آسودگی

اک زمانہ تھا کہ جب خوش حال تھے تیرے مکیں — پرورش کرتی تھی اپنے کاشتکاروں کی زمیں
تھوڑی محنت میں اُگل دیتی تھی فصلِ بے بہا — حسبِ حاجت، رزق کرتی تھی زمیں سبکو عطا
تندرستی سادگی دونوں سے وہ تھے بہرہ ور — بہتریں دولت یہ تھی، دولت سے تھے وہ بے خبر

۵

کسانوں کی زمین کا چھن جانا

ہائے اب کیا وقت آیا کیا زمانہ ہے بُرا — تاجروں کا ایک بیک تجھ پر یہ نرغہ کیوں ہوا
غصب کر لی لو وہ آکر کاشتکاروں کی زمیں — کر دیا بے خانماں ظالم ہوئے خود جانشیں!
چھوٹی چھوٹی بستیاں بکھری ہوئی تھیں کل جہاں — اب وہاں ڈھنڈار ہے کچھ اُونچے اُونچے ہیں مکاں
خواہشیں دولت سے وابستہ جو رہتی ہیں مدام — ظالموں کو بس یہی دردِ سری ہے صبح و شام
حسرتیں، ناکامیاں، رنج والم ہیں اُن کو آج — کبرِ نخوت کو، حماقت اپنا دیتی ہے خراج
چین کی وہ گھڑیاں وہ آرام و راحت اب کہاں — نفس جس سے مطمئن تھا وہ فراغت اب کہاں
وہ تمنّائیں کہاں، محدود تھی جن کی طلب — پُوری ہو جاتی تھیں اک ساعت بے رنج و تعب
ملک کی زینت تھی جن سے کیا ہوئیں وہ بازیاں — تندرستی کی محافظ ان کی تھیں دلچسپیاں
حُسن سے اُن کے چمک اٹھتا تھا کیسا مرغزار — تھا نگاہِ آرزو میں ان کا جلوہ آشکار

الغرض، جو ملک کی تھیں خوبیاں زائل ہوئیں — مہرباں ساحل کو تاکا دُور جا کر بس گئیں
ہائے وہ پیارے کسانوں کی مسرت اب کہاں — ان کی دلکش سیرتوں سے ہو گیا خالی جہاں

۶

دردِ دل کا اظہار

اے مری اوبرن پیاری، اے مری آرامِ جاں — چین کی گھڑیوں کی تو مولد تھی اے رشکِ جہاں
بند ہیں راہیں تری سنسان سبزہ زار ہے — تیرے غارت گر کی طاقت کا انھیں اقرار ہے
سیر کو تنہا نکل جاتا ہوں جب میں گاہ گاہ — جھاڑیوں میں تیرے ویرانوں کی، باحالِ تباہ
آہ کیا اجڑے نظر آتے ہیں مجھ کو وہ مقام — چپے چپے آبادیوں کے تھے جہاں ہر صبح و شام
سُرخ پھولوں سے لدی وہ جھاڑیاں وہ سبزہ زار — آج کیا خاموش آتی ہے نظر اُن کی بہار
یاد آتی ہے تری، بیدار ہو کر بار بار — ساتھ لاتی ہے دواں پیکِ تصور کی قطار
یک بیک ہوتا ہے دل پر اک ہجومِ رنج و غم — دورِ ماضی کو بنا جاتی ہے تصویرِ الم

دلی آرزو کا پورا نہ ہونا

اپنا افسانہ کہوں، کیا ٹھوکریں کھاتا پھرا — فکر میں جھیلی کڑی، ناشاد دکھ بھرتا رہا
تھی یہ دل میں آرزو، پھر لوٹ کر آتا میں گھر — جھاڑیوں میں تیری، کچھ دن چین سے کرتا بسر
روح کو آرام ملتا، فکر سے ہوتی نجات — اور جلتی کوئی دم، بجھتی ہوتی شمعِ حیات
بوئے نخوت تھی بھری، سر میں یہ تھا دل میں خیال — کاشتکاروں کو دکھاتا اپنا میں فضل و کمال
آگ کے جب گرد آ کر بیٹھتے وہ میرے گھر — حالِ دل کہتا، سناتا ان کو رودادِ سفر
جس طرح خرگوش کا صیاد کرتے ہیں شکار — اور کتّوں کے تعاقب سے وہ کرتا ہے فرار
خون میں ڈوبا ہوا مجروح باحالِ تباہ — کرتا پڑتا، اپنے گھر آ کر، وہ لیتا ہے پناہ
میں بھی مرتا اپنے گھر دل میں یہی تھی بس آرزو — وہ تمنائیں مٹیں اے مرگ اب باقی ہے تو

گوشۂ عزلت کی خوبیاں

مرحبا اے گوشۂ عزلت، خوشہ اے لامکاں
خوب مکر وہاتِ دنیا سے تو دیتا ہے اماں

ناتوانوں کا ہے ہمدم، مونسِ پیری ہے تو
میری قسمت میں نہیں تھا، خوب کرلی جستجو

اے خوشا جس نے کیا ہو کنج میں تیرے بسر
چین کی پیری، جوانی محنتوں میں سر بسر

اے خوشا وہ ترکِ دنیا کا کیا جس نے خیال
لذتوں سے جس کی، کر سکتا نہیں کوئی جدال

ہیں قوی تیرے اثر، تیری کشش ہے برق خیز
دُور ہو، اے زالِ دُنیا، تجھ سے بہتر ہے گریز

مرحبا اے پارسا اے نیک خو، عزلت گزیں
موردِ رنج و محن ہرگز نہیں تو، آفریں

تیری خوشنودی میں مخلوقِ خدا مرتی نہیں
خواہشوں پر تیری، جان اپنی فدا کرتی نہیں

سیم و زر مرکر، کوئی لاتا نہیں تیرے لئے
قعرِ دریا میں کوئی جاتا نہیں تیرے لئے

وردیاں پہنے کوئی درباں نہیں در پر ترے
ٹھوکروں سے فاقہ کش سائل کو جو زخمی کرے

آگے آگے ہی بڑھی جاتی ہے تیری زندگی
موت سے تو سامنا کرنے میں کتنا ہے جری

ہر طرف سے تجھ کو گھیرے ہے فرشتوں کی پرا
وہ محافظ ہے ترا، مونس ترا، اے پارسا

رفتہ رفتہ قبر کی جانب کو، یوں جھکتا ہے تو
بے خبر اینا ؤں سے ہو کر گزر جاتا ہے تو

خوئے تسلیم و رضا سے راہ تیری قبر کی
ڈھالواں ہوتی گئی ہے، (موت آساں ہے تری)

آرزوئے وصل سے (ایمان روشن ہے ترا)
تا دمِ آخر چمکتی جائے گی جس کی ضیاء

بن گئے سب کام تیرے، ہوگئی تیری نجات
مل گئی دنیا میں جنت لے تجھے قبل از ممات

۸

شام کا خوشنما منظر

غلغلوں کی وہ ترنم ریز موجوں کا شکوہ
شام کو قریہ سے جانا، گونج کر، بالائے کوہ

سیر کو اُوپر نکل جاتا تھا جب میں کوئی دم
بے خبر آہستہ آہستہ اٹھاتا تھا قدم

وہ صدائیں شور و غل کی، زیر کوہِ بافضا
درد سے اک نغمۂ شیریں کا دیتی ہیں پتا

گیت گانا وہ گوالن کا، وہ در پردہ خطاب
دُور سے گا گا کے دہقانوں کا دینا وہ جواب

نیک دل گایوں کا چر کر شام کو آنا بہم
اپنے بچوں کے لئے بمبانا ان کا دمبدم

ہنس کا وہ شور، لڑکوں کے وہ ہلّڑ کی پکار
مدرسے سے چھُوٹ کر وہ غل مچانا بار بار

پاسباں کتّوں کا شک پر بھونکنا وہ دمبدم
آگیا جھونکا اگر کوئی ہوا کا کم سے کم

وہ صدائیں قہقہوں کی، زور سے آتی ہوئی
دل کی بے فکری کی تصویریں، جھلک جاتی ہوئی

کتنی پیاری بن کے آتیں یہ صدائیں جاں فزا
کنج میں جب بُلبلیں خاموش ہوتیں اک ذرا

اُس کا موازنہ

اب وہ آبادی کی دل خوش کن صدا آتی نہیں
زمزموں سے گونجتی، موجِ ہوا آتی نہیں

کیوں نظر آتا نہیں ہے کوئی سرگرمِ خرام
سبزہ اُگ آیا ہے راہیں بند کیوں ہیں صبح و شام

(پھول مرجھائے ہوئے ہیں مے نہیں ساقی نہیں)
زندگی کے خوشنما آثار اب باقی نہیں

ایک بڑھیا پھوس باقی ہے وہ آتی ہے نظر
دُور وہ دیکھو لبِ جو ہے جھکی اس کی کمر

سن رسیدہ ناتواں ہے بھوک سے ہو کر نڈھال)
گھر سے نکلی ہے وہ فکرِ موت میں باخستہ حال)

خوش نما کرمی[1] کی بیلیں جو ہیں پانی کچھ بڑھیں
کھینچ کر ان کو کنارے، نوچتی ہے وہ کھڑی

---

[1] ایک قسم کا آبی پودا

بہرِ سرما چُن رہی ہے جھک کے تنکے خار دار
(ناتواں ہے انتہا کی، کانپتا ہے جسمِ زار)

شام کو اک جھونپڑے میں جا کے لیتی ہے پناہ
صبح تک رو کر بسر کرتی ہے با حالِ تباہ

چھوڑ کر اُس کو گئی پیارے کسانوں کی قطار
ہائے یہ اک نیم جاں بس رہ گئی ہے یادگار

(سب سے کرتی ہے بیاں غمناک بربادی کا حال)
تیرے ویرانوں کی ہے وہ اک مورخ با ملال

۹

واعظِ قریہ، اسکی پاک زندگی اور سخاوت

جس جگہ پہلے کبھی پھولا پھلا گلزار تھا
وہ گلِ خود رو جہاں اب بھی اُگے ہیں جا بجا

جس جگہ دیکھو وہ ہیں دلکش گھنیری جھاڑیاں
تھا وہاں پر، گاؤں کے واعظ کا چھوٹا سا مکاں

(مرد کیا دیں دار تھا، رحمت خدا اس پر کرے)
ملک کے چھوٹے بڑے سب پیار کرتے تھے اُسے

کچھ امیروں سے زیادہ تھا غنی وہ بے ہوس
سال میں چالیس اشرفیاں ملا کرتی تھیں بس

دُور آ کر شہر سے کر لی تھی اُس نے نوکری
پارسائی میں بسر کرتا تھا اپنی زندگی

(پوری ہو جاتی تھیں اس سے حاجتیں اسکی سبھی)
نوکری چھوڑی، نہ بدلی کی تمنا کی کبھی

نے خوشامد کی تھی عادت، نے زمانہ ساز تھا
(تھا وہ پابندِ اصول اپنا عجب انداز تھا)

(سخت تھا اپنے عقیدہ میں نہ پروا تھی اُسے)
بات منہ دیکھی نہ کہتا مال و دولت کے لیے

لوٹ جس پر دل تھا اس کا قوم کا آرام تھا
(سر میں بس سودا سمایا تھا رفاہ عام کا)

اس کو خود اپنی ترقی کا نہ تھا ہرگز خیال
ہاں غریبوں کو بڑھانے میں وہ رکھتا تھا کمال

گھر سے واقف اس لئے تھے نادار مفلس مستہام
(صبح سے لے کر بندھا رہتا تھا تانتا تا بہ شام)

ڈانٹتا پہلے کہ کیوں پھرتے ہو آوارہ وطن؟
(کیوں بنی ہے غم کی صورت کیوں ہیں یہ رنج و محن)

(آبدیدہ ہوتا سُن کے، پھر مصائب کے بیاں)
اور دردِ زندگی سے بخشتا ان کو اماں

ایک سائل جو بسا اوقات آتا تھا وہاں
بے تکلف ایک دن اس کا ہوا وہ میہماں

(قد تو اوسط تھا، مگر داڑھی تھا لمبی اس قدر
بوڑھے سینے کو دیا کرتی تھی بوسے جھوم کر

مٹ چکا تھا صرفِ بیجا سے بہت نادار تھا
کچھ نہ باقی تھا غرور اب بے کس و ناچار تھا

ایک دن کچھ سوچ کر، دعویٰ قرابت کا کیا
اور حقوق اپنے وہ آخر کار منوا کر رہا

لولا لنگڑا اک سپاہی، پھر وہاں وارد ہوا
گھر ہیں واعظ کے، ٹھہرنے کے لئے کی التجا

آگ کے پاس آکے بیٹھا شام کو وہ نیک ذات
آپ بیتی کہہ سنائی کاٹ دی باتوں میں رات

اپنے زخموں کا کیا پھر حال رو رو کر بیاں
اور کی جب ختم اُس نے درد و غم کی داستاں

جھک کے لے لی اپنی لکڑی سر نشانے پر کیا
فتح ہوتی ہے لڑائی کس طرح دکھلا دیا

اپنے مہماں کی ادا پر خوش ہوا وہ نیک خو
سوزِ ہمدردی بڑھا، دل ہو گیا غم سے لہو

درد و غم نے میہمانوں کے کیا اتنا اثر
ان کے نیک و بد کی جانب کی نہ کچھ اس نے نظر

(رحم آیا جوش میں جذبات لہرانے لگے
چہرے پر آثارِ ہمدردی نظر آنے لگے)

(صدمۂ اندوہ و غم سے پڑ گئی دل میں خراش
وہ بھلے تھے یا بُرے اس کی نہ کی مطلق تلاش

(آگا پیچھا کچھ نہ سوچا، مال و زر لا کر دیا)
رحم نے جود و سخا سے، پہلے کام اپنا کیا

۱۰

اس کے ادائے فرض کی خوبیاں

بے کسوں کے کام آتا تھا یونہی وہ باخدا
فخر کرتا تھا، مسرت اس کو ہوتی تھی سوا

(انتہا کا رحم تھا، حد سے زیادہ تھا سخی)
لغزشیں بھی اس کی نیکی کی جانب کو جھکی

فرض اپنے ادا کرنے میں، جب ہوتی طلب
شوق سے تیار رہتا تھا وہ ہر دم با ادب

دکھ میں تھا ہر اک کا حامی، دل میں رکھتا تھا اثر
حال پر روتا تھا ان کے سب کی رکھتا تھا خبر

جس طرح اک پیاری چڑیا اپنے بچوں کے لئے
جن کے ننھے ننھے خوش آئند بازو پر نئے

پہلے خود اڑ کر بلاتی ہے انھیں منقار سے
یوں سکھاتی ہے فضا میں سیر کرنا پیار سے

اچھی باتوں کو سکھاتا تھا یونہی وہ باخدا — وہ سمجھتے گر نہیں، تو ڈانٹ دیتا تھا ذرا

عالمِ بالا کے مژدے دے کے بہلاتا انھیں — اپنی طرزِ زندگی سے، راہ پر لاتا انھیں

۱۱

اُس کی تلقین

آہ جس جا اک بچھڑتی زندگی سوتی تھی اور — رنج و غم، ایذا، پشیمانی جہاں کرتی تھی دور

سُن کے آتا تھا وہاں پر خود (مقدس باخدا) — مرنے والے کے سرِ بالیں وہ رہتا تھا کھڑا

یاس اور ایذاؤں پر اُس کے، یہ پڑتا تھا اثر — بھاگ جاتیں، کشمکش میں رُوح کو وہ چھوڑ کر

چین آتا، فرحت و تسکین کا ہوتا نزول — دم ٹھہر جاتا تھا (ہوتی تھیں دعائیں یوں قبول)

کانپتی آواز سے رک رک کے، کچھ وہ بولتا — آخری جنبش زباں کی حمد کو کرتی ادا

وہ عبادت گاہ میں آنا وہ اس کا انکسار — دل رُبا وہ سادگی اس کی، وہ صورت وہ وقار

اس کی مقدس زندگی اور ہر دل عزیز ہونا۔

وہ حقائق کے بیاں اس کی زباں سے بار عام — سننے والوں کے دلوں پر اپنا کر جاتے تھے کام

نقل کرنے کے ارادہ سے جو آتے تھے خیرہ سر — خود وہ پڑھ جاتے نمازیں، اس قدر ہوتا اثر

ختم کرتا تھا نمازیں جب وہ عبدِ حق شناس — شوق سے، ہر ایک دہقاں دوڑ کر آتا تھا پاس

چھوٹے بچے تک بھی، پیچھے اس کے آتے تھے نظر — تھام لیتے تھے عبا کو چپکے چپکے، دوڑ کر

مسکرا دیتا تھا ان کو دیکھ کر وہ باصفا — (بھولی بھولی وہ ادا، وہ اُن کی صورت دلربا

تھا لبوں پر اک تبسم (دل میں بحرِ غم نہاں) — جن سے تھیں مہرِ پدر کی سی عیاں سرگرمیاں

پاکے خوش دہقانیوں کو، خود اسے ہوتا سرور — ان کی ناداری مگر، دل کو دکھاتی تھی ضرور

اس کا دل، اس کی محبت، اس کے رنج و غم ملال — ساتھ تھے ان کے وہ ان کا شریکِ درد و حال

یہ تو تھا لیکن وہ رکھتا تھا بہت گہرے خیال / (جی ہی جی میں سوچا کیا زندگی کا ہے مآل

عالمِ بالا میں جیتا، دل ٹھہرتا تھا وہیں / (باعثِ تسکینِ خاطر اس کا تھا خلدِ بریں

جس طرح اک مرتفع باشان، کوہِ بافضا / پھیل کر دامن میں اپنے، شان سے اٹھا ہوا

بڑھتے بڑھتے اس قدر، بڑھتا ہے سوئے آسماں / چھوڑتی ہیں راہ میں طوفان کو اس کی چوٹیاں

ابرِ باراں اس کی چھاتی پر گرجتے ہیں اِدھر / اور سر پر، نور رہتا ہے ہمیشہ جلوہ گر

١٢

معلمِ قریہ اسکی سیرت اور علوم دانی

راہ پر جس جا الجھتی جھاڑیوں کی ہے قطار / اور آتی ہے جہاں بے سود پھولوں کی بہار

پاس اس کے گاؤں میں تھا ایک چھوٹا سا مکاں / شور و غل کی جس سے آتی تھیں صدائیں الاماں

ایک جابر مولوی تعلیم دیتا تھا وہاں / مدرسہ پر اپنے ظالم شان سے تھا حکمراں

آدمی وہ سخت تھا صورت تھی اسکی خشمگیں / (جانتا تھا اس کو میں یا میرے نافل ہم نشیں)

(زہرآلودہ وہ تیور، یاد ہیں اچھی طرح / بھاگنے والے نہ بھولیں گے، کبھی میری طرح

سہم جاتے دیکھ کر لڑکے اُسے چیں بر جبیں / آفتیں دن کی نمایاں، صبح کے چہرے پہ تھیں

نقل کرتا جب بیاں، لڑکوں سے خوش ہو کر کبھی / کھل کھلا کر ڈر سے ہنس دیتے تھے وہ جھوٹی ہنسی

گھورتا جب، ہوتیں کانا پھوسیاں یوں سر بسر / چُپ کے چُپ کے دوڑ جاتی بدشگونی کی خبر

یہ بجا لیکن وہ لڑکوں پر بہت تھا مہرباں / علم کا خواہاں تھا اُن کے، اس لئے تھیں سختیاں

اس کی معلومات کے چرچے تھے قریہ میں تمام / جانتا ہے کس قدر وہ، تھا یہ حیرت کا مقام

تھا یقیں اس کا کہ لکھ سکتا تھا وہ عالی جناب / اور لکھنے کے علاوہ جوڑ لیتا تھا حساب

ناپ سکتا تھا زمیں کو، بات تھی مانی ہوئی / اور تاریخیں مقرر اس کی تھیں جانی ہوئی

مدتیں کاموں کے کرنے کی بتا دیتا تھا وہ / جزر و مد آئے گا کب اس کا پتا دیتا تھا وہ

بات سننے بیچ آ گئی تھی یہاں تک جابجا
برتنوں کے بیچ کی وہ ناپ سکتا تھا فضا

اور رموزِ بحث کو وہ خوب تھا جانے ہوئے
اس کا لوہا واعظِ قریہ تھا خود مانے ہوئے

اس لئے کہ ہار کر بھی چپ نہیں ہوتا تھا وہ
بند ہو جاتا تھا تاہم بحث کر سکتا تھا وہ

وہ ادق الفاظ، اور وہ عالمانہ ان کے قد
وہ گرجتی ان کی آوازیں وہ ان کا شدومد

(جب کبھی تقریریں کرتا آتے سب چھوٹے بڑے)
اس کا منہ تکتے تھے دہقاں چپ کے حیرت سے کھڑے

بندھتی جاتی ٹکٹکی، حیرت سے بول اٹھتے اری
ایک اس چھوٹے سے سر میں آتنی باتیں ہیں بھری

(نام تک اس کا نہیں، اب جاننے والا کوئی)
شہرتیں کل اُس کی باتیں ہیں گئی گزری ہوئی

کامیابی پر وہ اپنی فخر کرتا تھا جہاں
اس جگہ تک کا کہیں باقی نہیں ہے اب نشاں

۱۳

میخانہ قریہ اور اس کی دلربا شان

سرکشیدہ جھاڑیاں کانٹوں کی ہیں جس جا کھڑی
ایک در پر تھی وہاں خوش رنگ سی تختی جڑی

جانے والوں کی نگاہیں تھیں، ٹھہر جاتی وہاں
دورِ کیف افزائے رنگیں کا چلتا تھا جہاں

بے نشاں ہے وہ مکاں (مستانہ تھی جس کی نوید)
وجد کرتی تھی جہاں ہنستی ہوئی ریش سپید

مسکراتے شام کو مزدور آتے تھے وہاں
(اف رے میخانے وہ تیرا مست اور دلکش سماں)

(آہ جس جا خاک میں پنہاں پڑا ہے تیرا گھر)
باتیں کرتے تھے سیاستِ دانِ قریہ بے خبر

وہ نگاہیں ان کی سنجیدہ، وہ اخباری بیاں
مے تو تازہ[1] اور پرانی سے پرانی[2] داستاں

وہ تری آرائشیں اور وہ ترا جاہ و جلال
ڈھونڈھتا ہے ان کو کس شوق و تمنا سے خیال

وہ سپیدی تیری دیواروں کی، وہ اس کی جلا
ریگ آلودہ ترا وہ فرش کیا اچھا بنا

۱-۲ے پرانی شراب اور تازہ خبر اچھی ہوتی ہے ۔

وہ مجلی اک گھڑی رہتی تھی جو سرگرمِ کار / اور پسِ در سے گیا کرتی تھی کھٹ کھٹ بار بار

کتنا کار آمد ترا صندوقِ خانہ دار تھا / شب کو بستر، دن کو سرمائے کا ذمہ دار تھا

باعثِ زینت تھیں عبرت خیز تصویریں تری / بزمِ شاہی اور وہ بے جاں بازیٔ کبک دری

(تری دیواریں ادب آموز تھیں اے مرحبا) / قاعدے اخلاق کے کندہ تھے جن پر جابجا

تیرا آتش دان جب خاموش ہوتا تھا کبھی / پھول پتّی شاخیں سوئے کی لدی سبھی

ٹوٹے پھوٹے چائے کے پیالوں کی وہ دہری قطار / تیری بھٹی پر وہ ان کے جگمگانے کی بہار

(دیکھنے والوں کے دل پر تھا عجب دلکش اثر) / حسن آرائش میں دانائی تھی تیرے سر بسر

۱۴

میخانے کی ویرانی

ہائے یہ آرائشیں فانی تھیں تیری بے اثر / (دل ٹپک جاتا تھا) جن کے جلوۂ بے سود پر

بوجھ وہ گرتی عمارت کا نہ تیرے لے سکیں / خود ہوتیں جاں بر نہ تجھ کو وہ سنبھالا دے سکیں

قعرِ گمنامی میں، اب تیری عمارت ہے پڑی / دل غریبوں کا بہلتا تھا جہاں دو اک گھڑی

پاس تیرے فکرِ دل لے کر، کوئی جاتا نہیں / غم غلط کرنے کسانوں میں کوئی آتا نہیں

حال اخباروں کا دہقانی نہیں کرتے بیاں / (گاؤں کی خبروں کا سننا، اب نہیں ممکن یہاں)

قصّہ گوئی اور افسانے اب سُنا جاتے نہیں / اب لکڑہارے وہ گیت آ کے گا جاتے نہیں

اب لہار آتا نہیں کوئی قریں تیرے نظر / صاف چہرا جو کرے اپنا، سیاہی پونچھ کر

پھر وہ جھک جائے ذرا قصّوں کو سننے کیلئے / استراحت تا قوی اعصاب کو اس کے ملے

دیکھنا پھرتا نہیں ہے، خود ترا اب میزباں / تا چھلکتے جام کا چلتا چلے، دورِ رواں

اب وہ شرمیلی تیری ساقن، نہیں آتی نظر / منتظر دل سے ہو، جو اصرار کی، خود سیم بر

(منتوں کے بعد آتی ہوئی آئے شتاب) / آئے ذرا چکھ کر، بڑھا دے ناز سے جام شراب

۱۵

غربا اور امرا کی مسرتوں کا موازنہ

اے غریبوں کی مسرت، اے نشاط دلپذیر
مضحکہ کرتے ہیں تیرا، گو حقارت سے امیر

میرے دل سے کوئی پوچھے، حسنِ فطری کو ترے
ظاہری زیباتشوں سے، زیادہ پیارا ہے مجھے

لذتوں سے بیخودی کی، تیری میں ہوں باخبر
تیری پیاری سادگی میں ہے عجب دلکش اثر

تیری دل آویزیوں سے رُوح پاتی ہے مزا
جذبۂ فطری کو، کرتی ہے تو جولانی عطا

اور بے فکری کے عالم میں عجب انداز سے
رقص کرتی ہے مچل کر، تو دلوں میں ناز سے

ہے خلش ایذا پہنچنے کی، نہ دھڑکا رشک کا
شادمانی کی تری، کوئی نہیں ہے انتہا

رحمتِ خالق ہے تو، اور وہ امیروں کی امنگ
محفلیں وہ دھوم کی، جلسے خوشی کے ناچ رنگ

روپ بھرنا ناچنا راتوں کو ان کا دیر تک —
بھاری جوڑوں پر وہ دولت کے لٹانے کی سنک

(جھالریں منقش کی، میز پر وہ تاجِ زر نگار)
(وہ جھلا جھل، مال و دولت کے تماشوں کی بہار)

ہیں یہ کل دلچسپیاں لیکن (پر از رنج و ملال)
ان کے شیدائی نظر آتے ہیں، خود پژمردہ حال

سیر ہو جانے سے پہلے اُن کی فرح جانستاں
ہوتے ہوتے بے مزہ، بن جاتی ہے ایذائے جاں

محو پاکر، کہتی ہے دل کی پشیمانی کہ بس؟
شادمانی کیا اسی کا نام ہے اے بوالہوس

۱۶

سامانِ عیش غریبوں کو ضروریاتِ زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔

ماہرِ علمِ سیاست! راستی کے دوستو
(کیا غضب ہے تم ذرا انصاف تو دل میں کرو)

روز بڑھتی جائے دولت کی خوشی جاہ و جلال
اور غربت کی مسرت کو، ہو ہر لحظہ زوال

ملک کی خوش حالیاں بہتر ہیں یا جاہ و حشم
سچ بتاؤ؟ فرق ان دونوں میں ہے کتنا اہم

زر و نقرہ سے، لدے آتے ہیں بانخوت جہاز
بار پر اپنے، تلاطم خیز موجوں کو، ہے ناز

نعرۂ پُر جوش ہیں ساحل سے (آنکھیں ہیں لڑی)
خیر مقدم کو، حماقت ہے تماشائی کھڑی

طمع کر سکتا ہے جتنی اک حریصِ دل حزیں
مال و زر کے ہیں ذخیرے، اس سے بھی زائد کہیں

دھوم ہے عالم میں، دولت کے تماشے ہیں بچے
ہر طرف سے آ رہے ہیں تاجروں کے جم گھٹے

(ہیں غرض لا انتہا گنجینۂ لعل و گہر)
فائدہ لیکن کچھ بھی، ذرا سوچو اگر

نام کی دولت ہے وہ (باعث جو ہوا ادبار کی)
ملک میں جس سے، نہ افزائش ہو پیداوار کی

(فائدے دولت کے کیا ہیں؟ چاہو پھر ان کو گنو)
اب رہا نقصان، وہ اس سے زیادہ ہے سنو

ایک دولت مند کا، اتنی زمیں پر ہے اثر
سیکڑوں بندے خدا کے جس میں کرتے تھے بسر

وسعتِ صحنِ چمن پر، (فصل کو ہارے ہوئے)
تال اس کا، سیکڑوں ایکڑ زمیں مارے ہوئے

گردشیں کتوں کی اُس کے، کیا کشادہ ہیں بنیں
توشہ خانے ہیں کہیں، اصطبل گھوڑوں کے کہیں

مضمحل وہ اس کے اعضا، ریشمی پوشاک میں
(محشرِ صد آرزو پنہاں دلِ غمناک میں)

آہ مزروعہ زمیں یوں رفتہ رفتہ چھٹ گئی
لطفِ پیداوار سے محروم ہو کر لٹ گئی

اونچے اونچے کچھ محل ہیں شان سے تنہا کھڑے
چار سو ٹکڑے زمیں کے، کیسے ویراں ہیں پڑے

جھونپڑے اس جا غریبوں کے کبھی تھے ہم کنار
ہو کے رسوا، اٹھ گئے، خالی پڑا ہے سبزہ زار

عیش کے ساماں کے بدلے، بائے پیداوارِ خام
بِک رہی ہے کوڑیوں کے مول، عالم میں تمام

الغرض جتنے ہیں اسبابِ مسرت بہتریں
اُن سے سرتا پا مُزیّن ملک کی ہے سرزمیں

نامُراد آرائشیں اس کی ہیں، کتنی دل فگار
اپنی بربادی کا خود اس کو ہے، بس اب انتظار

۱۷

عیش ملک کے زوال کا باعث ہے۔

جس طرح کوئی، زنِ چالاک خوش روبے نقاب
کشورِ دل پر حکومت جس کی، رکھتا ہے شباب

سادگی سے دل لبھا لیتی ہے جادو ڈال کر
حُسن پر پوشاک کے، نفرت سے کرتی ہے نظر

(شام کو بننے سنورنے کی، ادا بھاتی نہیں)
عارضی زیبائشوں کو دھیان میں لاتی نہیں

(زیب و زینت کو سمجھتی ہے وہ اک فنِ رکیک)
قبیح میں، اپنی نگاہوں کی نہیں کرتی شریک

ہاں زیادہ ہوتا ہے، جب رفتہ رفتہ سن و سال
اور جوانی اس کی ڈھل جاتی ہے آتا ہے زوال

(حسن ذاتی کا، نہیں رہتا ہے باقی کچھ اثر)
چاہنے والے بہت کم، اس کے آتے ہیں نظر

شوق سے پھر زیبِ تن کرتی ہے جوڑے زرنگار
اور دکھاتی ہے چمک کر حسن کی جھوٹی بہار

اک نئی سج دھج سے ہوتی ہے، وہ یوں جلوہ نما
پیار اور اُلفت جتاتی ہے، ہر اک اسکی ادا

رنگ میں ڈوبا ہوا جو ملک ہو، اس کی زمیں
بس سمجھ لو، آہ، گویا ہے مثال اس کی یونہیں

خوبیاں جو اولاً قدرت سے ہوتی ہیں عطا
حسن کی وہ سادگی (وہ سبزہ زاروں کی فضا)

جھاڑیاں وہ خوشنما پھولے ہوتے وہ لالہ زار
ہاں دکھاتی ہے زمیں، کس کس طرح اپنی بہار

عیش کے لیکن مزوں کی، جوں ہی پڑتی ہے بنا
خوبیاں نظارۂ قدرت کی ہوتی ہیں فنا

(حُسن لُٹ جاتا ہے، ہوتی ہے زمیں یوں پائمال)
شان و عظمت ملک کی، لاتی ہے ساتھ اپنے زوال

وہ امیروں کے محل، وہ خوشنما نقش و نگار
اور سڑکوں پر دو رویہ، وہ درختوں کی قطار

جس طرف جاؤ نظر آتا ہے سامانِ سرور
دیکھنے والوں کو اک حیرت سی ہوتی ہے ضرور

(گو نشاط افزا ہیں صنعت کے تماشے عزّ و جاہ)
ملک میں لیکن پڑا ہے قحط، حالت ہے تباہ

لو، کسانوں کی جماعت ہو کے فاقوں سے نڈھال
دل گرفتہ، جا رہی ہے ملک سے با صد ملال

ہو رہے ہیں وہ فنا، بے مونس و یاور، ادھر
اور شگفتہ اس طرف ہے ملک، اپنی شان پر

(کیا نظر آتی ہے توام شادی و غم کی بہار)
اک طرف پھولا چمن ہے، اک طرف تازہ مزار

۱۸

امرا غریبوں کی چراگاہ تک لے جاتے ہیں۔

آہ مفلس اب کدھر جائے کہاں آباد ہو؟
داب سے، تا نخوتِ ہمسایہ کی آزاد ہو

(ہو گیا بے خانماں ایذائیں ہیں ہر صبح و شام)
ہے سراپا درد کی تصویر گویا، تلخ کام)

اپنے گلوں کو وہ لے جا کر چرائے کیا مجال
غیر مزروعہ زمیں پر سوکھے تنکے خال خال

کر نہیں سکتا چراگاہوں میں بھی اپنی بسر
بانٹ لیتے ہیں اُسے آپس میں، ابنِ سیم و زر

اس کے رہنے کے لئے، کوئی جگہ باقی نہیں
ہے غضب، بحری زمیں پر بھی اس کو مل سکتی نہیں

١٩

غربا قریوں سے نکالے جاتے ہیں۔ اور جب شہروں میں آتے ہیں تو اُن کو ہر طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اور شہروں میں اگر جاتے وہ آوارہ وطن
منتظر اُس کی نئی ایذائیں ہیں تازہ وطن

بامزہ بہتی ہوئی دولت کا اک دلکش سماں
آہ کس حسرت سے آکر دیکھتا ہے وہ نہاں

صنعتیں، جھلک ہزاروں، اس کو آتی ہیں نظر
عیش کے ساماں کی ہے، جن سے ترقی جلوہ گر

دیچ ہے لیکن ملک کا ابتر ہوا جاتا ہے حال،
قوم کی افراد کم ہوتی ہیں (بڑھتا ہے زوال)

(کیا نظر آتے ہیں اسبابِ مسرت عزّ و جاہ)
(جن کی صناعی میں کام آکر، ہوتیں جانیں تباہ)

طرفہ آتا ہے نظر، شانِ مسرت کا حشم
جس کا ماخذ، نوعِ انسانی کا ہے درد و الم

دیکھتا ہے وہ، ادھر درباریوں کو جلوہ گر
جان جوکھوں کام میں، معروف ہیں صنّاع ادھر

وہ مرصّع ریشمی پوشاک اُن کی شان دار
اور ان کے زرد چہرے (جسم لاغر دل فگار)

وہ جلوسِ مقتدر کا، شان سے کرنا گزر
دوسری جانب کو، کالی سولیاں[1] وہ راہ پر

وہ محل آراستہ اور وہ امیروں کے مکاں
نصف شب کو جس میں رہتی ہے مسرت حکمراں

زیبِ تن ملبوسِ زرّیں، وہ نقیبوں کی پکار
بانزک وہ آنے والوں کی قطار اندر قطار

---

[1] شاہِ عام پر مجرموں کو سزا دیجاتی تھی۔

صحن میں شعلہ فشاں، وہ مشعلیں ہر سو، وہ دھوم
تند خو، وہ خادموں کی شان و شوکت کا ہجوم

وہ سماں پچھلے پہر کا، رات وہ ڈھلتی ہوئی
گاڑیاں وہ لڑکھڑاتی، شمع وہ جلتی ہوئی

خوشنما، دلکش، یہ جلسوں کے مناظر ہیں ضرور
اور بے شک غم سے خالی ہیں یہ سامانِ سرور

میں نے مانا، ملک میں کیفِ مسرت عام ہے
حق جو پوچھو، یہ تماشہ اک خیالِ خام ہے

۲۰

دیہات کی نادان عورتیں شہر میں آکر کیا کیا ایذائیں اٹھاتی ہیں۔

مڑ کے دیکھو تو، وہ اک بیکس زنِ بے خانماں
کس طرح جاڑوں سے تھرتھر کانپتی ہے الاماں

گاؤں کی خوش حالیوں سے تھی کبھی وہ بہرہ ور
زندگی کرتی تھی اپنی، شادمانی میں بسر

ذلت و خواری کو ناداں کی جب سنتی تھی وہ
حالِ عبرتناک پر، رو رو کے سر دھنتی تھی وہ

وہ ادائیں، وہ جوانی جوش پر آئی ہوئی
جھونپڑے میں حسن کی اسکے ضیا چھائی ہوئی

زینتِ غربت کدہ تھیں، یوں نگاہیں شرمسار
جس طرح چھائی ہو کانٹوں پر گلِ ترکی بہار

مٹ گئی آکر یہاں، اپنے یگانوں سے چھٹی
ذلّت و رسوائیاں کیا کیا ہوئیں عصمت لٹی

(اس کے شیدائی نظر آتے نہیں ہیں اب کہیں،
مر چکے سب چاہنے والے کوئی باقی نہیں

پھانس کر جو لایا اس کو (جس سے آنکھیں تھیں لڑی)
بے وفا ظالم کے در پر جان کھوتی ہے پڑی

تند بوچھاروں کی یخ کی تاب لا سکتی نہیں
سہم کر چہرہ چھپا لیتی ہے جا سکتی نہیں

دل میں کیا کیا اپنے پچھتاتی ہے با حزن و ملال
شہر میں آنے کا کیوں دل میں ہوا پیدا خیال

حوصلہ افزا امیدوں نے ابھارا اس قدر
گھر سے اپنے ہو گئی، اک دن روانہ بے خبر

کس بری ساعت میں چرخے سے جدا اپنے ہوئی
ہائے کیوں دیسی روا کو چھوڑ کر گھر سے چلی

ل گاؤں کی لڑکیاں جو شہر میں آوارہ زندگی بسر کرتی ہیں۔

٢١

اَوبرن کی عورتوں کی یہی حالت ہے۔؟
نہیں اس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔

اے حسین اَوبرن کیا تری زنانِ مہ لقا — اس طرح کی آفتوں میں ہیں گرفتارِ بلا
یخ کی ایذاؤں سے یا ہو کر وہ فاقوں سے نڈھال — خود پرستوں سے کیا کرتی ہیں، روٹی کا سوال
سُن لے کیا تجھ سے کہوں جب سے چھٹا پیارا وطن — (ہائے اُس سے بھی زیادہ، ان کے ہیں رنج و محن)
کالے کوسوں، حارہ خطّے میں ہیں وہ مسکن گزیں — بیچ میں، آدھے کرہ کی ہے محبّ سر زمیں
جادہ پیما، ناتواں قدموں نے ساتھ ان کا دیا — چلتے چلتے، جا کے دنیا کے ادھر منزل لیا
(راہیں پُر آشوب ہیں، اور آفتوں کا سامنا) — درد و غم پر ان کے، نوحہ خواں ہے نہر التما
اب کہاں وہ دلربا منظر، کہاں دلچسپیاں — کتنی وحشت خیز ایذائیں یہاں ہیں، الاماں
آئے دن، شعلہ فشاں سُورج کا، وہ آنا نظر — برچھیاں تانے ہوئی، جلتی کرن کا رُخ ادھر
(بال بکھرائے غضب میں، وہ نگارِ آتشیں) — ڈالتا ہے قہر آلودہ نظر سوئے زمیں
وہ شرر افشانیاں دن کی، وہ تابش وہ جمال — تاب لائے آنچ کی، اُس کے کوئی، اف کیا مجال
دھوپ کی شدت سے مُرغانِ چمن خاموش ہیں — بھول کر نغمہ سرائی، کنج میں روپوش ہیں
وہ گھنے جنگل کی تاریکی، جہاں دیکھے ہوئے — اونگھتے چمگادڑوں کے جھنڈ ہیں لٹکے ہوئے
دامنِ صحرا میں، زہریلی ہوا چھائی ہوئی — سبزۂ نورخیز پر مہلک بہار آتی ہوئی
کالے کالے بچھوؤں کو، زہر کی وہ جستجو — موت کے ساماں فراہم کرتے پھرنا چار سو
ہر قدم پر دل دھڑکتا ہے، یہ ہوتا ہے یقیں — کینہ جو، پھنکارتے افعی، نہ جاگ اٹھیں کہیں
گھات میں بیٹھا ہے شیرِ گرسنہ بھی بے قرار — ہے سیہ بختی کا، صیدِ بے خبر کی، انتظار
(ظالم و بے رحم اور سفاک قاتل، الاماں) — شیر سے بھی بڑھ کے ہیں خونخوار باشندے یہاں

چرخ کھاتی، تند و پرآشوب کالی آندھیاں — خاک اڑاتی مثلِ دیوانوں کے چلتی ہیں یہاں
ڈالیاں اڑتی نظر آتی ہیں بالائے فضا — ایک کر دیتی ہیں دم میں، عالمِ ارض و سما
کس قدر حالت یہاں کی ہے مخالف دل شکن — آہ دلکش مناظر، ہائے وہ پیارا وطن
(دامنِ کہسار میں پھولی ہوتی وہ شاخسار) — سرد جھرنوں پر، وہ سبزے کے لہکنے کی بہار
با فضا و کنج، وہ گنجاں شاخیں سایہ دار — چوم جاتے تھے جنھیں جھونکے ہوا کے بار بار
(عاشقوں کا چھپ کے جانا پپیہوں کا وہ خروش) — چوریاں وہ پاک الفت کی، وہ خلوت پردہ پوش

۲۲

جس وقت اپنا پیارا وطن چھوڑ کر روانہ ہوئے تو دل پر کیا گزری۔؟

دردِ دل میں، لب پر آہیں، حال تھا ان کا زبوں — التہابِ غم سے، تھا روزِ جدائی تیرہ گوں
چھوڑ کر پیارا وطن جس دم چلے وہ تلخ کام — ہو چکا تھا خاتمہ جن کی مسرت کا تمام
تھا ہجوم یاس و غم، حیراں کھڑے تھے بے خبر — جھونپڑوں پر ڈالتے تھے آخری اپنی نظر
با دلِ غمگیں ہوئے، رخصت وطن سے نامراد — دیر تک تکتے رہے حسرت سے، کہ کر خیر باد
کاش مل جائے عبث یہ آرزو ان کو ہوئی — بحرِ مغرب سے ادھر، شاید جگہ ایسی ہوئی
جان جوکھوں تھا سفر تھرا رہا تھا جسمِ زار — سامنے لہرا رہا تھا بحرِ ناپیدا کنار
آئے واپس خوف کھا کر، دل بھر آیا رو دئے — پھر بڑھے پھر لوٹ آئے، آہ و زاری کے لئے
سن رسیدہ، نیک دل، بابا تھا کوئی پیرِ مرد — غیرتِ ایماں سے رکھتا تھا وہ اپنے دل میں درد
موت کی تھی آرزو، طالب وہ اس عالم کا تھا — قبر کی جو دوسری جانب کو شاید ہے بسا
دوسروں کے غم میں روتا خود نہ تھی پروا اسے — سب سے پہلے ہو گیا، آمادہ چلنے کے لئے
ایک پیاری اس کی لڑکی تھی، پری وش مہ جبیں — کچھ زیادہ جو نظر آتی تھی رونے میں حسیں
تھی سہارا عالمِ پیری کی، وہ جانِ پدر — سن رسیدہ باپ کی، ہمدرد مونس، چارہ گر

بے نیازِ عشق ہو کر، حسن کی پرواہ نہ کی — ساتھ ہو لی، باپ کے آغوش کو ترجیح دی
فرطِ غم سے مادرِ ناشاد جی کھونے لگی — دردِ دل کا بین کر کے، پھوٹ کر رونے لگی
جھونپڑے کو تھا جو سرچشمہ مسرت کا کبھی — دیکھ کر حسرت سے روئی، اور دعائے خیر کی
گود میں معصوم بچّوں کو اٹھا کر لے لیا — خوب روئی بھینچ کر، اور رو کے پھر بوسہ دیا
(ماں کا منہ تکتی تھیں حیرت سے وہ ننھی مورتیں) — غم میں کیا پیاری نظر آتی تھیں، پیاری مورتیں
پیارے شوہر نے جو دیکھا حال بیوی کا برُا — دی تشفی اس کو، مردانہ تحمّل خود کیا

۲۳

عیش و عشرت کی برائیاں جو رفتہ رفتہ ملک کو زوال پہنچاتی ہیں۔

اے نشاطِ مال و زر، اک وہمِ شیطانی ہے تو — ابتدا سے راندۂ درگاہِ یزدانی ہے تو
قوم کی بربادیوں کی خلق میں بانی ہوئی — قابلِ نفریں ہے تو، یہ بات ہے مانی ہوئی
خوبیوں کی جا، تو نے کتنی برُھی، مہلک وبا — بادۂ گلگوں میں تیرے سمِ قاتل ہے گھلا
(ملک میں پھیلاتی ہے کس کس طرح تو اپنا زور) — جان لیتی ہے پلا کر، آہ اک جامِ سرور
شادمانی میں تری زہرِ دغا کا ہے اثر — تیرے کیفِ بے خودی میں موت آتی ہے نظر
ملک کی تو شان و شوکت کو بڑھاتی ہے ضرور — جگمگاتی اپنی طاقت پر، وہ کرتا ہے غرور
مضمحل سی اسکی شوکت کی، وہ شوریدہ سری — (چند روزہ رونقِ دولت کی، وہ جادوگری)
پھولتا جاتا ہے پی کر زہر آلودہ شراب — لا نہیں سکتا ہے پھر آماسِ ثروت کی وہ تاب
(رفتہ رفتہ حال ہوتا ہے برُا بیمار کا) — درد و ایذا کی نہیں رہتی ہے کوئی انتہا
سلب ہو جاتی ہے، طاقت جسم کی یوں دفعتاً — سوچ کر بیکار ہو جاتا ہے ہر عضوِ بدن
چھوڑ کر بربادیوں کو وہ گرفتارِ بلا — غرق ہوتے ہوتے، ہو جاتا ہے آخر خود فنا
لوٹتا ہی ملک میں، سرگرمِ کار آتی نظر — ختم آدھا کر چکی ہے کام اپنا، خیرہ سر

اب بھی جب سوچ میں، حیرت زدہ ہوں میں کھڑا
دیکھتا ہوں، شادمانی گویا ہوتی ہے فنا

(آہ کس جور و ستم سے) چھوڑ کر یہ سرزمیں
خوبیاں دہقانیوں کی، جا رہی ہیں دل حزیں

دور وہ، گویا نظر آتا ہے، مجھ کو اک جہاز
بادباں موج ہوا میں، (چھیڑتا ہے غم کا ساز)

کس طرح بیکار لہراتا ہے، محوِ انتظار
چوم جاتے ہیں اُسے جھونکے ہوا کے بار بار

چپ کھڑا ہے چھوڑ کر لنگر، جہاز اندوہگیں
اک جماعت جا رہی ہے سرنگوں اس کے قریں

دل گرفتہ، بانگاہ یاس کرتی ہے گزر
آہ ساحل تیرہ و تاریک آتا ہے نظر

محنت و آسودگی، مہماں نوازی، چاہ پیار
خوبیاں دہقانیوں کی ہیں یہ گویا آشکار

کس طرح ہیں زہد کی فردوس سے آنکھیں لڑی
پارسائی و وفاداری، وہاں پر ہیں کھڑی

٢٥

شاعری سے خطاب

اے پیاری شاعری اے میری حور مہ لقا
دلکشی خوش آیند ہے، تیری ادائے دلربا

دیکھتی ہے تو گلِ عشرت کو جس جا عطر بیز
سب سے پہلے چھوڑ کر، نفرت سے کرتی ہے گریز

ابتری سے وقت کی (دل میں تو کیوں ہے شرمسار)
(لذتوں کو تیری کیا جانے) وہ ننگ روزگار

کیا بُرے ایام ہیں شہرت تو پا سکتی نہیں
اب دلوں کو، اپنا شیدائی بنا سکتی نہیں

اے مری خوش رو پری اے میری پیاری دلفریب
(ہو گیا تاراج تیرا آہ، حسنِ دلفریب)

لوگ نفرت کرتے ہیں تجھ کو سمجھتے ہیں بُرا
(کی گئی توہین تیری، اور میں رسوا ہوا)

خلق میں میرے لئے گو ننگ رسوائی ہے تو
مایۂ نازش ہے پیاری فخر تنہائی ہے تو

تو ہے وجہ شادمانی اے نگارِ (خوبرو)
سارے درد و غم کی لیکن آہ سرچشمہ ہے تو

بارِ اوّل جب ملی مجھ سے، تو میں نادار تھا
اور اب تک تو نے مجھ کو آہ ویسا ہی رکھا

نیکیوں کو پرورش کرتی ہے تو اے پارسا
بہترین فن و حرفت کی ہے، سچی رہنما

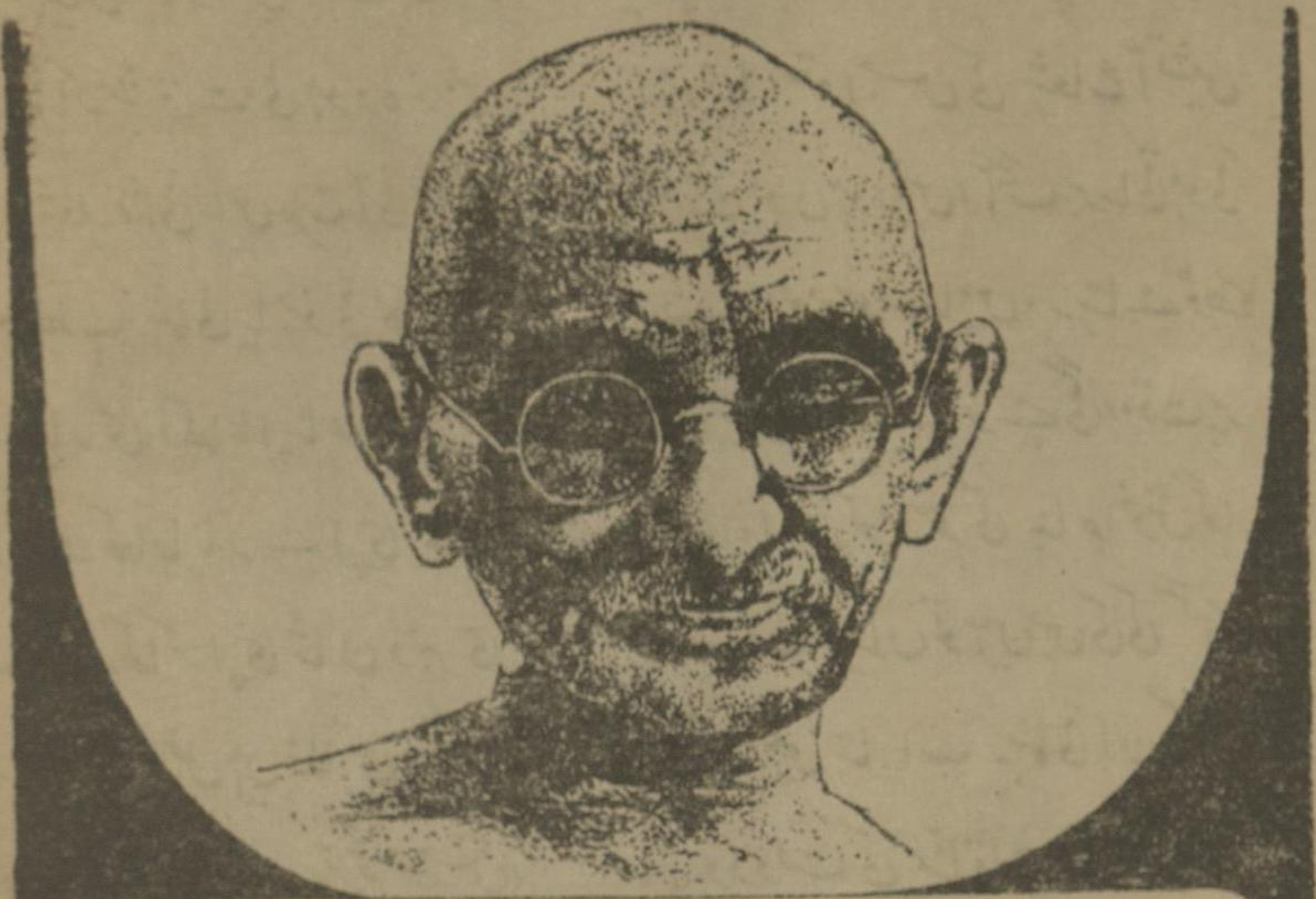
یاد رکھنا، تیری غربت پر، فدا ہوتا ہوں میں — اے مری پیاری، خدا حافظ، جدا ہوتا ہوں میں
امتحاں تیرا ہو جب اور جس طرح اے خوش نوا — اپنے جذباتِ ترنّم کا، دکھانا معجزا
ٹارنو[1] کی چوٹیاں، یا دامنِ کہسار ہو — یا کہ ہمبا مارکا[2]، کا وادیٔ پرخار ہو
(حدِ مغرب یا کہ مشرق سے، ملی ہو وہ زمیں) — یا ہو خطِ استوا جس کی شعاعِ آتشیں
(کرتی ہوں شعلہ فشانی، اس طرح آتی ہوئی) — گرم چلتی ہوں ہوائیں، آگ برساتی ہوئی
خواہ ہو قطبِ شمالی یا جنوبی کا سرا — برف سے، جو موسمِ سرما میں، رہتا ہے ڈھکا
(الغرض، پیاری دکھانا اپنا عالم میں اثر) — آفریں تیری بقا غالب رہے گی، وقت پر
آمد کو آ دکھا جا ناز سے اپنی بہار) — سخت ایذاؤں کو موسم کی بنا جا خوش گوار
محو کر دے تو دکھا کر اپنی شانِ دلبری — وہ صداقت کبریاں توہین جس کی کی گئی
خوئے انسانی میں داخل ہیں خطائیں درگزر — کام کی باتیں بتا۔ اب رہنمائی ان کی کر
خوب سمجھا دے انھیں، (تیرے ترنّم ہو جس) — مال و دولت کی تمنّا قابلِ نفریں ہے بس
نغمۂ دلکش سے اپنے، یہ اصول ان کو سکھا — وہ ممالک، جن کو فطرت سے ہوئی طاقت عطا
گو بہت نادار ہیں (دولت سے کوسوں دور ہیں) — عالمِ غربت میں لیکن، شاد اور مسرور ہیں
(اور انھیں اتنا سکھا دے اے نگارِ دلنواز) — ملک وہ جس کو بہت اپنی تجارت ہے ناز

تجارت سے زیادہ ملک کی پیداوار پر بھروسہ کرنا بہتر ہے۔

مال و زر ہوتا ہے آخر جان کا اس کی وبال — جا رہا ہے، اس طرح تیزی سے وہ سوئے زوال
جس طرح بحرِ رواں پشتوں کو اپنے کاٹ کر — ڈال دیتا ہے بہا کر دم میں ساحل کے اُدھر
طاقتیں، جن کو توکل ہے خود اپنی ذات پر — وقت کا یوں سامنا کر سکتی ہیں دتزکار کر
جس طرح محکم چٹانیں (ڈت کے ساحل پر اڑی) — روکتی ہیں موج اور طوفان کو تنہا کھڑی

---

[1] سویڈن کے ایک دریا کا نام جسکے قریب پہاڑی ہے۔ [2] جنوبی امریکہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔



مطبوعاتِ ولا اکیڈمی

دین یار جنگ زندگی اور کام	برق موسوی	۴-..
سخن در سخن (مجموعۂ رباعیات)	نواب مظفر الدین خاں صاحب	۴-..
افق در افق	″ ″	۸-۵۰
ادراکِ معنی	طیّب انصاری	۶-..
میرا شہر میرے لوگ	″ ″	۵-..
مفہوم القرآن (پارہ ۱ تا ۹)	کیف بھوپالی (فی پارہ)	۲-..
نگارشاتِ حمایت	کرنل حمایت بیگ	۳-..
وجود و شہود	عطا کلیانوی	۴-..
صحرا کا سفر	راہی قریشی	۳-۵۰
نذرِ خرد	ایس۔ ایس لانبہ	۷-..
میخانہ (مجموعۂ کلام)	میکش حیدرآبادی	۱۰-..
محمّد بن عبدالوہاب	محی الدین احمد	۵-..
اردو الفاظ شماری	حسن الدین احمد	۸۵-..
مقدمہ۔ اردو الفاظ شماری	″ ″	۳-..
انجمن (سوانحی مضامین کا مجموعہ)	″ ″	۱۵-..
جامع العطیات	ضیاء الدین احمد شکیب و حسن الدین احمد	۴۵-..
داستانِ غم (فارسی) طبع دوم	شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ	۲۰-..
تاریخ النوائط حصہ اول	″ ″ ″	۲۰-..

ولا اکیڈمی عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴